جلد ۹۶ فروری ۱۹۸۲ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

کی

اوّلین تصنیف

الجہاد فی الاسلام

- جو کہ ۲۴ سال کی عمر میں تحریر کی گئی۔
- جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔
- جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔
- اِسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔
- دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات۔

اور

- بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ
- اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل
- جہاد کے مخالفین و معترضین کا مُسکت جواب
- درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

۶۰۰ صفحات ○ قیمت : ۳۶ روپے

اِدارہ ترجمان القرآن

اچھرہ ○ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۶	فروری ۱۹۸۲ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ	عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ———— ۴۱-۳۱۶

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آخر وفاقی کونسل بن گئی اور اس کا پہلا اجلاس منعقد ہو چکا۔ اب جب کہ ایک ادارہ نمودار ہو گیا ہے تو اختلاف رکھنے کے باوجود دعا کرنی چاہیے کہ خدا اسے ملک و ملت کے لیے ذریعۂ خیر بنائے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ اس پر مجلس شوریٰ کی خالص اسلامی اصطلاح کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ فی الحقیقت اس کا نقشۂ کار وہ نہیں ہے جو مجلس شوریٰ کا ہونا چاہیے۔ مجلس شوریٰ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی خود تجویز کردہ معیار پر کچھ "اچھے" لوگوں کو جمع کر لیا جائے۔ اور ان کا کام یہ ہو کہ وہ اپنی سفارشات حکمران طبقے کے سامنے رکھ دیا کریں۔ جو کسی بات کو مناسب سمجھے تو اختیار کر لے اور مناسب نہ سمجھے تو اسے مسترد کر دے۔ اسلامی شورائیت کا یہ تصور جو پچھلے سال دو سال میں ابھرا ہے، بعض علماء اور حکام اور دانشوروں کی شدید ذہنی الجھنوں کا آئینہ دار ہے۔

اوّل تو اسلام میں مناصب (خصوصاً جن کا تعلق اقتدار یا نمائندگی سے ہو) کے لیے ایک جانا پہچانا متعین معیار ہے جس کے کچھ جانے پہچانے تقاضے ہیں۔ پابندیٔ عبادات، حرام معاش اور مشاغل سے اجتناب، علم و بصیرت جس کا ایک پہلو دین کا شعور چاہتا ہے اور دوسرا پہلو موجودہ دنیا کے نظریات، تجربات، جدید ادارات، خارجی سیاست کی پیچیدگیوں اور داخلی ملکی مسائل کی الجھنوں کے فہم پر مشتمل ہوتا ہے، پھر دیانت اور عدل وہ لازمی شرائط ہیں جن کو پورا کیے بغیر کوئی آدمی اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کا وہ حصہ کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتا جو اس سے متعلق ہو۔

دوسرے یہ ضروری ہے کہ اس معیار پر جانچ پرکھ محض درونِ خانہ عمل میں آ کر فائلیں ہی تیار نہ ہو گئی ہوں، بلکہ یہ امر ضروری ہے کہ ارکانِ شوریٰ کے ایمان، علم اور کردار پر عوام کا اعتماد واضح طور

پر معلوم ہو کہ فلاں آدمی کو ملک بھر میں، یا کسی صوبے میں یا کم سے کم کسی خاص حلقۂ آبادی میں قیادت یا رائے دہی کا اہل سمجھا جاتا ہے اور لوگوں کی ایک کثیر تعداد اس کے گرد جمع ہوتی ہے۔

تیسری یہ لازم ہے کہ مجلس شوریٰ کی رائیں اور فیصلے کسی فردِ واحد یا کسی وزارت یا پس پردہ کام کرنے والی مجلس سے بالاتر ہوں۔ مغربی جمہوریت کی مخالفت میں یہ غلط خیال پھیلا دیا گیا ہے کہ وقت کے حکمران عوام کی آرا کو جانے بغیر جن لوگوں کو بھی چاہیں، مشاورت کے لیے پسند کر لیں اور پھر ان کے فیصلوں کو چاہیں تو قبول کریں اور چاہیں تو قبول نہ کریں۔

مجلس شوریٰ کا ایسا تصور نہ دورِ سعادت میں موجود رہا ہے (جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے مقرر کردہ حاکم تھے اور ان پر براہ راست وحی آتی تھی) اور نہ دورِ خلافتِ راشدہ میں۔ حضورؐ نے غزوۂ بدر، احد اور احزاب میں اپنے اہلِ شوریٰ کے مشوروں کو قبول کیا اور اپنی جداگانہ ذاتی رائے پر عمل نہیں کیا، ماسوا ایسے اُمور کے جن کے لیے آپؐ نے خدا تعالیٰ کے القا کردہ کسی امر یا اپنے پیغمبرانہ مرتبے کے کسی لازم تقاضے کا اجرا فرمایا۔ اتفاق سے ترجمان القرآن میں اسلام کے شورائی نظام پر ایک اچھا مقالہ شائع ہو رہا ہے جس کی ایک قسط اس مرتبہ بھی پیش کی جا رہی ہے۔ ہمارے نزدیک اُن مفسرین و شارحین نے حکم کو صحیح سمجھا جنھوں نے اہلِ شوریٰ کے مشوروں کی پابندی کو مسلم حکمرانوں پر از روئے قرآن لازم قرار دیا ہے۔ امر واقعہ بھی یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین نے اپنی مجالسِ شوریٰ کے فیصلوں (یا غالب رایوں) کے مقابلے میں کبھی راہِ تفرد اختیار نہیں کی۔ بلکہ جن واقعات کو غلطی سے لوگ اس امر کی نظیر بتاتے ہیں کہ خلفائے راشدین نے مشورہ تو لے لیا، مگر اقدام اپنی مرضی سے کیا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ مثال کے طور پر سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف فوجی کارروائی کا جو فیصلہ کیا یا عراق کی زمینوں کے بارے میں سیدنا عمر فاروقؓ نے جو حل نکالا، ان مواقع پر انھوں نے اپنے دلائل کے زور سے اہلِ شوریٰ کو اُس نقطۂ نظر کا قائل کر لیا جسے وہ صحیح سمجھتے تھے۔ اگر مجلسِ شوریٰ سے ہم آہنگی لازم نہ ہوتی تو آخر کیوں حضرت عمرؓ عراقی زمینوں کے متعلق بحث کو لمبے وقت تک جاری رکھتے۔ وہ دوسروں کی باتیں سن کر انھیں اس قول کے ساتھ رخصت کر دیتے کہ حضرات! آپ سے ہم نے مشورہ لے لیا اور رائیں یا سفارشیں حاصل کر لیں۔ اب آپ تشریف لے جائیں، ہم اپنا فیصلہ نافذ کر لیں گے۔ یہ تو سیدھی صاف سڑک آمریت و استبداد کی طرف جاتی ہے

جس سے نجات پانے کا کوئی راستہ بھی نہیں رہتا۔
تو ہمارے مطالعہ کی رُو سے یہ بات حتمی ہے کہ حکمران اور مجلس شوریٰ مل کر حکومت کا نظام چلاتے ہیں اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں سے انحراف کر کے اپنے ذاتی نقشوں کے مطابق حکاّم کو اقدام کرنے کا حق نہیں ہے۔
آج جب کہ اسلامی نظام کا ابتدائی ڈھانچہ بھی ابھی نہیں بنا اور اس کے متعلقہ لوازم پورے نہیں ہوئے۔ اوّل تو مجلس شوریٰ کا بیچ میں نمودار ہو جانا قابل فہم نہیں ہے اور اگر ایسا ہو بھی تو کم سے کم متذکرہ تین وجوہ سے وفاقی مجلس کے لیے مجلس شوریٰ کی اصطلاح کا استعمال خود اسلام کے لیے نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ جلی عنوانات اگر اسلامی لگا دیے جائیں اور اُن کے نیچے مضمون اور نفسِ معنی عنوانات کے مطابق نہ ہو تو اس سے اسلامی اصطلاحات کی قدر و قیمت تباہ ہو جائے گی۔ کسی بھی اسلامی اصطلاح کو اسی وقت استعمال کیا جائے جب اسلامی ادارات کی صحیح تشکیل کا سامان ہو جائے۔

یہ حقیقت رازدارانہ نوعیت کی ہے کہ نامزدگیوں کے معیارات کیا ہیں؟
لوگوں کو ایک عرصہ پہلے سے یہ یقین دلایا جاتا رہا ہے کہ اسلامی ذہن کے بہت ہی صاف ستھرے کردار کے لوگ، جو دیانت و قابلیت سے بھی آراستہ ہوں، کونسل میں لائے جا رہے ہیں۔
اب جب کہ ڈرامے کے سارے کردار نائیلون کے پردے کے پیچھے سے نکل کر اسٹیج پر آگئے ہیں، عجیب و غریب باتیں واضح ہوتی ہیں۔
خاصی تعداد میں وفاقی کونسل کے لیے نامزدگیاں پرانے جاگیردار خاندانوں کے حلقے سے کی گئی ہیں۔ جن کے افراد پہلے بھی ہر دور میں لیڈری اور نمائندگی اور وزارتی "خدمات" کرتے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس انسانی برتری سے جس طرح انگریزی اور سکندر حیاتی دور میں، یا ایوبی اور پیپلی دور میں خادمانِ قوم ملتے رہے ہیں، اسلامی دور کے اہلِ شوریٰ کی فراہمی بھی جاری رہے۔
وفاقی کونسل کے ارکان میں پارٹیوں کی نسبت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو دو ہی گروہوں کی بڑی تعداد شامل ہے۔ ایک مسلم لیگ، دوسرے پیپلز پارٹی۔ مسلم لیگ پر کوئی تنقید مطلوب نہیں، اگر یہاں محض

حالات کو سمجھنے کے لیے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس محبِ پاکستان جماعت کے افراد میں نہ سیاسی یک جہتی ہے اور نہ کسی طرح متعین پروگرام کا کوئی تصور پایا جاتا ہے۔ بکھرے ہوئے افراد اور ٹولیاں ہیں جنہیں کوئی مفاد یا مخالفانہ حملہ وقتی طور پر متحد کرسکتا ہے۔ اس کے بالمقابل پیپلز پارٹی کے لوگ اول تو ایوان کی ایک تہائی نشستوں پر قابض ہیں، دوسرے ان میں بزعمِ خویش "عوام دوست" ہونے کا رشتہ موجود ہے۔ فی الحال تو یہ گروہ دم بخود ہونے پر مجبور ہے لیکن آگے چل کر یہ کیا گل کھلائے گا، کسی کو اندازہ نہیں، مگر پھر بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کونسل میں پیپلز پارٹی کے حلقے سے آنے والوں میں وہ بھی ہیں جنہیں پچھلے کارناموں کے تحت موجودہ حکومت نے قابلِ احتساب گردانا تھا۔ پھر وہ بھی ہیں جن کو سات سال کے لیے انتخابات سے محروم قرار دیا گیا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ محروم تو انتخابات سے قرار دیا گیا تھا، غیر انتخابی مجلس میں نامزدگی پر کیا اعتراض۔ اعتراض کی کیا مجال، مگر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انتخاب سے محروم قرار دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کردار کے لحاظ سے اس قابل نہیں ہے کہ وہ حکومت و نیابت کے دروبست میں آسکے۔ مگر نیرنگیٔ ایام ہے کہ ایسے اصحاب اسلامی نظام کی طرف حکومت کے پیش قدمی میں تعاون کرنے کے لیے وفاقی کونسل میں لائے گئے ہیں جسے سرکاری طور پر "مجلسِ شوریٰ" بھی کہا گیا ہے۔

ایسے حضرات بھی ہیں جو سرے سے یہی نہیں جانتے کہ نقطۂ استحقاق کیا ہوتا ہے اور تحریکِ التوا کیا معنی رکھتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی اٹھ کر یہ کہے کہ صاحبان! یہ نکتۂ استحقاق اور تحریکِ التوا وغیرہ کے طریقے مغربی جمہوریت سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا ہم اسلامی حکومت اور اسلامی ایوان میں ان چیزوں کا جاری رکھنا صحیح نہیں سمجھتے۔ ابھی تو اور بہت سی چیزیں ہیں جن کے بارے میں "مغربی جمہوریت" کے نئے مخالفین سخت الجھیں گے۔ معلوم نہیں کل کوئی واعظ و فقیہہ یہ بھی کہے کہ "مجلسِ شوریٰ" کا اجلاس تو لازماً مسجد میں ہونا چاہیے، یہ "ایوان" وغیرہ کا سلسلہ تو مغرب کی کافرانہ جمہوریت کا ہے۔ بہرحال یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، کہنا یہ تھا کہ بعض حضرات کوچۂ سیاست سے نابلد ہیں۔ کیوں نہ ہو جب سیاست ایک مکروہ عمل قرار پاچکی ہے اور آج دنیا جہان کی خرابیوں کی ذمہ داری سیاست والوں کے سر ہے، لہٰذا وفاقی کونسل میں سیاست نا آشنا حضرات کو آنا چاہیے تھا۔ لیکن تضاد یہ ہے کہ کونسل میں سیاست کی کوچۂ ملامت کی سیر گشت کرنے کے شائق بھی موجود ہیں۔

تصویر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اختصاصی پیشوں والے بعض ایسے اصحاب بھی نامزد ہوگئے ہیں جن کی یک رنگ مصروفیات نے انہیں کبھی موقع ہی نہیں دیا کہ وہ عالمی اور ملکی سیاسیات کا مطالعہ کرسکیں یا عوام میں چل پھر کر اُن کے مسائل و مشکلات کو معلوم کرسکیں یا کچھ اُن کی ذہنی تربیت اور تنظیم کرسکیں نہ انہیں اس کا تجربہ کہ وہ عوام کی نمائندگی کریں، نہ اُن کو مشق کہ وہ حکومتی فیصلوں کو لے کر اُن تک جائیں اور اُن کے اندر حامیانہ یا ناموافقانہ رجحانات پیدا کرسکیں۔

اصلاً سیاست ایک ہمہ وقتی کام ہے اور اس کا بڑا حصہ تعلیم و تنظیم عوام پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو لوگ برسوں اس ہمہ وقتی کام میں پڑتے ہیں، وہ خود بھی اس کام کے ذریعے اپنی تعمیر کرتے ہیں۔ سیاسی لوگ مجمعوں میں جاتے ہیں، کبھی نعرے سنتے ہیں اور کبھی گالیاں کھاتے ہیں، اختلافی بحثوں کے جواب دیتے ہیں، پریس کانفرنسوں کا سامنا کرتے ہیں، کبھی لاٹھیاں کھاتے اور جیل جاتے ہیں۔ اس طویل اور کٹھن جادۂ عشق پر چل کر کام کے آدمی تیار ہوتے ہیں۔ یہ درست کہ کچھ لوگ غلط نظریات یا غلط مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں، مگر صحیح نظریہ اور صحیح مقاصد کے لیے بھی کام کرنے کا راستہ یہی ہے۔

بخلاف اس کے جو شخص عمر بھر کسی چار دیواری میں بیٹھ کر درس دیتا رہا ہو، میڈیکل پریکٹس میں مصروف رہا ہو، کسی کارخانے میں مشین ورکر ہو، اچھا زراعت کار ہو، اس نے اگر سیاست کے سمندر میں اُتر کر کبھی تھپیڑے نہ کھائے ہوں تو وہ عوام کی نیابت کیا کرے گا اور حکومت کو مشورہ کیا دے گا۔

مختصر یہ کہ وفاقی کونسل کی ہیئتِ ترکیبی کا یہ بھی ایک پہلو ہے۔

وفاقی کونسل کے پہلے اجلاس ہی سے اندازہ ہوگیا ہے کہ اب سیاست کا کواڑ کسی قدر کھل گیا ہے، سوالات اٹھائے جانے لگے ہیں، شکایات پیش کی جانے لگی ہیں۔ وزرا کسی نہ کسی طرح کے ایک ایوان میں سوالوں کے جواب میں وضاحتیں کرنے لگے ہیں اور حکومتی کاموں میں دھیمی دھیمی تنقید ہونے لگی ہے۔ کارروائی پریس میں بھی آنے لگی ہے، کیونکہ سنسر اُٹھ چکا ہے۔

اہلِ حکومت نے وفاقی کونسل کو جس دائرے میں رکھنا چاہا تھا، شاید یہ اس دائرے میں محدود نہیں رہے گی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جہاں کہیں سیاسی سناٹا ہو، وہاں اگر آپ انسانوں کی ایک بڑی تعداد

کو جمع کر کے اُن کو بدلنے کا اذن دے دیں تو ملک بھر میں رُکی ہوئی بھاپ کسی نہ کسی طرح نکلے گی۔ دوسری یہ کہ جو لوگ ایوان میں پہنچے ہیں اُن میں تھوڑے سے اہلِ اخلاص اپنے خلوص سے مجبور ہیں کہ جن احساسات کو وہ اپنے چاروں طرف رچا بسا دیکھتے ہیں اور اُن سے متاثر بھی ہوتے ہیں، اُن کو بیان کریں، سے اربابِ مفاد سو اُن کو اپنے حلقہ ہائے ربط کے عوام میں اپنے نمبر بھی بنانے ہیں تاکہ انتخابات کے انعقاد سے پہلے پہلے وہ اپنے آپ کو امیدواری کا مستحق بنالیں اور لوگوں کے کچھ کام وام کرا کے انتخابی معرکہ جیتنے کی تیاری کریں۔

اغراض والے لوگ بھی ابھی سے بڑی اُمیدوں کے سامنے رجوع کریں، تبادلوں، مقدموں کے لیے اور بجلی لگوانے اور پاسپورٹ حاصل کرنے کے لیے اُن تک پہنچیں گے۔ وہ عرض مندوں کو لوٹا نہیں سکیں گے۔ اُن کے معاملات و شکایات کو انہیں ایوان تک اور سرکاری دفتروں اور تھانوں تک لے جانا ہوگا۔

ارکان پر یقیناً ایک تو اس احساس کا دباؤ ہوگا کہ وہ لوگوں کی طرف سے منتخب شدہ نہیں ہیں، بلکہ نامزد ہیں، دوسرے یہ کہ اصل مقصود تو جمہوری نظام کی بحالی اور انتخابات کی تیاری ہے۔ بیچ میں اُن کا دَور عبوری دَور ہے، بلکہ تیسرا احساس یہ بھی ہوگا کہ ہمارا مقام تو صرف رائیں اور مشورے دینا ہے، اب یہ تو کار پردازوں کی حکمت پر موقوف ہے کہ کس بات کو پسند کر لیتے ہیں اور کسے ناپسند۔

یہ سارے دباؤ ایسے ہیں کہ جن کے زیرِ اثر شرکائے ایوان میں یہ رجحان پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا ہے۔

دوسری طرف کشمکش یہ بھی ہے کہ حکومت نے ان کو نامزد کر کے ان کا مرتبہ بڑھایا ہے اور پھر آمدنی اور مراعات سے نوازا ہے۔ نیز انہیں حکومتی اداروں میں گھسنے اور کام کرانے کا موقع مل رہا ہے۔ لہٰذا وہ پوری طرح سرکشی بھی نہیں کر سکتے۔

پھر بھی ایوان میں جمہوری فضا کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے، جس کے لیے برسوں کی روایات و عادات بھی کام کر رہی ہیں۔

عین ممکن ہے کہ وفاقی کونسل سے کوئی ایسا ماحصل سامنے آئے جسے سوچنے والوں نے ہرگز نہ سوچا ہو۔

بڑی مبارک بات ہوئی کہ وفاقی کونسل میں اسلامی نظام کو قائم و جاری کرنے کے لیے قرارداد

پاس ہوئی۔ اس قرارداد کا وجود ایک دلیل ہے اس بات پر کہ پاکستان کے مقصدِ وجود اور قوم کے اجتماعی رجحانات کے مطابق موجودہ پیچیدگی احوال میں بھی ہمارے نامزد "غیر سیاسی" نمائندے "تک نظامِ اسلام پر نگاہیں مرتکز رکھتے ہیں۔ لادینیت پسندوں کو عبوری دَور کے غیر انتخابی ایوان نے بھی مایوس کیا ہے۔

ہم اس قرارداد کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں، اور اس بات کے آرزومند ہیں کہ ایک طرف اسلامی کونسل اسلام کے اہم تقاضوں کو جلد سے جلد حکومتی پالیسیوں اور قوانین کا درجہ دلوانے کے لیے اپنا کام کرے اور بیوروکریسی اس مقصد کو حاصل کرنے میں قوم کی راہ میں اڑنگے نہ لگائے۔ ساتھ ہی ہم وفاقی کونسل سے توقع کرتے ہیں کہ وہ خواجہ صفدر صاحب کی اچھی اُمیدوں کے مطابق اپنے آئندہ اجلاس میں جمہوری و انتخابی عمل کی بحالی کی سڑک ہموار کرے تاکہ اسلامی نظام کا قافلہ بخیریت اس سے گزر کر ایوانِ اقتدار تک پہنچے۔ درمیان میں پہاڑیاں اور کھائیاں حائل نہ رہیں۔

وفاقی کونسل کا ایک ردِّ عمل سیاسی جماعتوں اور نیم سیاسی مذہبی گروہوں میں بھی نمودار ہو رہا ہے۔ یعنی ایک بار پھر اتحاد کے چرچے ہیں۔ اور کچھ ہل چل سی محسوس ہوتی ہے۔

لیکن ابتدائی طور پر جو طرزِ فکر اور انداز و اطوار سامنے آئے ہیں وہ کچی کچی آرا اور بکھرے بکھرے نقطہ ہائے نظر کے ترجمان ہیں۔ پھر اس اتحاد کا قیام وہ لوگ کرنے چلے ہیں جن کا اصل زر "اختلاف" ہے۔ اور وہ بھی نفرت آمیز۔ بات بات پر جھمیلے اُٹھانا، ٹکراؤ پیدا کرنا، اپنی ہی صفوں کے ٹکڑے اُڑانا، عوام میں فتنے اُٹھانا، مسجدیں اور نمازیں الگ کرانا اور اسی طرح کے دیرینہ کردار کا ریکارڈ سروں پر لادے ہوئے ہمارے سیاسی و مذہبی اکابر "اتحاد اتحاد" کی پکار شروع کر رہے ہیں۔ اگر عوام کوچۂ سیاست میں صدا لگانے والے کسی بھی "اتحاد والے" کے سامنے اتحاد کا پچھلا فائل کھول کر رکھ دیں تو کیا وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے کارناموں کی وضاحت کر سکے گا۔ اساطینِ اتحاد نے اپنے ہی شرکائے اتحاد کے خلاف اتحاد کے زمانے میں اپنے خاص حلقوں میں، اور اتحاد کو تباہ کرنے کے بعد برسرِ عام ایسی معاندانہ افتراقی باتیں کہی ہیں جن کی طرف توجہ جائے تو اتحاد کی نئی کوششیں (باقی بر صفحہ ۴۷)

عقلِ وجدانی

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

دوسرا بڑا انعام جو بارگاہ خداوندی سے حضرت انسان کو عطا ہوا وہ عقلِ وجدانی ہے۔ عقلِ وجدانی حاسہ وجدانی یا حاسہ مذہبی سے ترقی پاکر پروان چڑھتی ہے۔ اس عقل کو اہل فلسفہ عقل کلی اور اہلِ تصوف عقلِ وجدانی اور ماہرین فنونِ لطیفہ عقلِ تخلیقی کہتے ہیں۔ حاسۂ مذہبی ہر انسان کی فطرت میں طبعی طور پر موجود ہے۔ یہ حاسہ مظاہر کائنات کی نیرنگی اور بوقلمونی پر قناعت نہ کر کے کائنات کے پس پردہ حقیقتِ مستور کا عرفان اور تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ تخم ہر فرد بشر کی سرشت میں موجود ہے۔ اگر کہیں سازگار ماحول میسر آجاتا ہے تو برگ و بار لے آتا ہے اور جہاں کہیں ناسازگار اور معاند ماحول ملتا ہے تو وہاں ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔

دیگر حواس کی طرح حاسۂ مذہبی کا بیج بھی انسان کی فطرت میں روز ازل ودیعت کر دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے "اور اے نبی، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں میں سے ان کی نسلوں کو نکالا تھا۔ اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ ٹھہراتے ہوئے پوچھا تھا — "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں" انہوں نے کہا تھا، ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔ ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کہا تھا کہ تم قیامت کے روز یہ کہہ دو کہ ہم اس بات سے بے خبر تھے۔" (اعراف - ۱۷۲) یہ آیت بتاتی ہے کہ ازل کے روز نسلِ انسانی کے ایک ایک فرد نے جلوۂ حق کا نظارہ کیا تھا۔ اس وقت سے جلوۂ حق کا پرتو فطرتِ انسانی کے نہاں خانہ میں موجود ہے۔ ہر انسان کے اندر طبعی طور پر ایک ایسا جاذبہ موجود ہے جو اسے حقیقتِ مستور کی تلاش اور جستجو پر ابھارتا رہتا ہے۔ عرفان حقیقتِ کبریٰ اور تقربِ ذاتِ حق کی کسک ہر دل میں چھپی ہوئی موجود ہے، خواہ وہ کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ ہر انسان

عرفانِ حق کا متلاشی رہتا ہے۔ خواہ عملاً اسے عرفانِ حق حاصل ہو یا نہ ہو۔

اس معاملہ میں نوعِ انسانی کی مثال اس روایتی شہزادے کے مشابہ ہے جس نے خواب میں کسی حسین دوشیزہ کا جمالِ جہاں آرا دیکھ لیا تھا۔ خواب میں ہی وہ اس عُمدہ جمال اور پری تمثال کو دل دے بیٹھا تھا۔ اس پر دل وجان سے عاشق ہو گیا تھا۔ پھر وہ حکومت وسلطنت کا سارا کاروبار چھوڑ کر اس حسین دوشیزہ کی تلاش میں سرگرداں نکل کھڑا ہوا تھا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم آرزو ست	از روزگارِ خویش ندانم جز ایں قدر

نوعِ انسانی بھی صدیوں سے تلاشِ حقیقت کے سفر پر رواں ہے اور اس کا سفر ختم نہیں ہوتا۔۔۔ انسانِ حیوانی کی طلب ضرور شہوتِ شکم اور شہوتِ جنس ہے۔ اور انسانِ عقلی (تجزیاتی) کی طلب جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت ہے۔ لیکن حقیقی انسان اخلاقی اور روحانی انسان ہے۔ حقیقی انسان کی طلب جلوۂ صفاتِ حق اور عرفانِ ذاتِ حق ہے۔

اہلِ فرنگ کی بدبختی بلکہ ساری انسانیت کی بدبختی کہ یورپ کے مادی مفکرین انسانِ حیوانی کو تسلیم کرتے ہیں، انسانِ عقلی کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن انسانِ اخلاقی اور انسانِ روحانی کے منکر بن گئے ہیں۔ انہوں نے علم وآگہی اور علوم وفنون کے قافلہ کو بے راہی اور گمراہی کے بیابانوں میں دھکیل دیا ہے۔ جہاں انسانیت کا قافلہ ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔

عقلِ وجدانی کے مظاہرات	عقلِ وجدانی کا اظہار بہر حال ہوتا رہتا ہے۔ جذبۂ اندرون کا مظاہرہ انسان کی روزمرہ کی زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔ انسان کے افعال میں اور اس کے کردار میں ہوتا رہتا ہے اس کی پسند میں اور اس کی ناپسند میں ہوتا رہتا ہے۔ بلکہ ذرا آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انسان کی ساری طلب وجستجو میں بہر حال اور بہر طور جلوۂ حق کا کوئی نہ کوئی پہلو پیشِ نظر رہتا ہے۔ تجلی حق کی کوئی نہ کوئی صفت اس کے دل ودماغ پر مستولی رہتی ہے تو یہ بات عین حق ہے۔ اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

حقیقتِ کبریٰ اور ذاتِ حق کے ہزاروں جلوے ہیں۔ سینکڑوں پہلو ہیں، صدہا انداز ہیں عقلِ وجدانی کے نزدیک اس کا ہر جلوہ محبوب ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا ہر پہلو جاذب ہے۔ اس کا ہر انداز مطلوب ہے۔ اس کے جلووں کی نہ حد ہے نہ حساب۔ وہ عظمت وجبروت ہے۔ وہ

حسن وجمال ہے۔ وہ قہر وجلال ہے۔ وہ رفعت وکمال ہے۔ وہ تقدس واستغنا ہے۔ وہ حق وصداقت ہے۔ وہ خیر وفلاح ہے۔ وہ جود وعطا ہے۔ وہ سکون وطمانیت ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "ہر روز وہ نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے۔" (الرحمان — ۲۹) "اللہ تعالیٰ کے اچھے نام ہیں۔ اس کو اچھے ناموں سے پکارو۔" (اعراف — ۱۸۰)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے ننانوے صفاتی نام ہیں۔ اللہ کو اس کے صفاتی ناموں سے یاد کرو۔" ساری خلقت میں، ساری کائنات میں اس کی صفات جلوہ افروز ہیں۔ جس چیز میں جس شکل میں، جس جا کوئی حسن ہے کوئی خوبی ہے کوئی کمال ہے، اس سب کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ مخلوق میں کسی کا بھی حسن ذاتی نہیں ہے بلکہ وہ خالق کا عطیہ ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ تمام حمد وستائش کا سزاوار اللہ تعالیٰ ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے۔

قرآن مجید نے صدہا مقامات پر مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کو پیش کیا ہے۔ وہ عقل وفکر کو اُن پر غور وخوض کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جس طرح مظاہرِ قدرت پر غور وخوض کرنے سے عقلِ تجرباتی پرورش پاتی ہے۔ اسی طرح مظاہرِ فطرت پر غور وخوض کرنے سے عقلِ وجدانی کی آبیاری اور پرورش ہوتی ہے۔ اس طریقہ سے قرآن مجید عقلِ وجدانی کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔

مناظرِ فطرت پر غور کرنے سے سب سے پہلے انسان کے اندر ذوقِ تجسس اور ذوقِ آگہی بیدار ہوتا ہے۔ انسان کا شعورِ آگہی بیدار ہوتا ہے۔ ذوقِ آگہی مزید ترقی کر کے اشیا کے خواص معلوم کرتا ہے۔ ان کے منافع اور فوائد سے آگہی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح انسان کے اندر شعورِ افادی نشوونما پاتا ہے۔ علوم سائنس کی ساری جدوجہد یا تو شعورِ آگہی کے تحت آتی ہے یا شعورِ افادی کے تحت آتی ہے۔ مظاہرِ فطرت میں قرآن مجید حسن وجمال کی طرف بھی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہے۔ اس طرح انسان کے اندر جمالیاتی شعور نشوونما پاتا ہے۔ ایک قدم آگے بڑھ کر انسان اس ہمہ جہت خوبی وکمال ہستی کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے جس کے فیضان کا چشمہ ہر جگہ جاری وساری ہے۔ علم وآگہی ہو، تمتع و افادہ ہو، حسن وکمال ہو، سب اسی سرچشمہ کا فیضان ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے اندر عرفانی اور الہیاتی شعور بیدار کرنا چاہتا ہے۔ شعورِ آگہی، شعورِ افادی، شعورِ جمالیاتی اور شعورِ الہیاتی عقلِ وجدانی کا ارتقائی سفر ہے۔ قرآن مجید اس راہ سے انسان کو جلوۂ حقیقت کی رہنمائی کرتا ہے۔

اقدارِ حیات — جلوۂ حق کا یہ پہلو عقلِ وجدانی کے لیے محبوب ہے اور مطلوب ہے۔ صفاتِ حق انسانی زندگی کے لیے اقدارِ عالیہ کا حکم رکھتی ہیں۔ انسانی زندگی کی یہ غایات ہیں۔ انسان کی حقیقی سرگرمی انہی اقدار کے حصول اور دریافت کی جدوجہد ہے۔ بہر طور اور بہر دم انسان ان اقدارِ عالیہ کے حصول کا طلب گار اور متمنی رہتا ہے۔ ان اقدار کے حصول کے لیے وہ ہر آن کوشاں رہتا ہے۔ ان کے حصول کے لیے وہ لڑتا ہے، جھگڑتا ہے اور بے چین رہتا ہے۔ جسمانی تقاضوں اور جبلی خواہشات کے مختصر سے دائرہ کو مستثنیٰ قرار دے کر انسانی شعور کی ساری سرگرمیاں درحقیقت اقدارِ عالیہ کی جستجو ہے۔ یعنی پرتوِ جلوۂ حقیقت کی تلاش ہے۔ اور یہی حقیقی انسان ہے اور یہی حقیقی سرگرمیاں ہیں۔ آیئے ذرا انسان کی روزمرہ زندگی کے چند واقعات پر نظر ڈالیے۔

۱۔ انسان کہتا ہے یہ چیز میری ہے ——— گویا وہ صفتِ حق کا اثبات کر رہا ہے۔

۲۔ انسان کہتا ہے یہ کیسا دلکش منظر ہے ——— گویا وہ صفتِ جمال کو مطلوب قرار دے رہا ہے۔

۳۔ انسان کہتا ہے یہ کتنی پرشکوہ عمارت ہے ——— گویا وہ صفتِ عظمت کو مطلوب قرار دے رہا ہے۔

۴۔ انسان کہتا ہے یہ کتنی خوفناک بجلی کڑکی ہے ——— گویا وہ صفتِ جلال کا اعتراف کر رہا ہے۔

۵۔ انسان کہتا ہے یہ کتنا سخی داتا ہے ——— گویا وہ صفتِ جود و سخا کو مطلوب قرار دے رہا ہے۔

۶۔ انسان کہتا ہے یہ شے بڑی مفید ہے ——— گویا وہ صفتِ خیر کو مطلوب قرار دے رہا ہے۔

۷۔ انسان کہتا ہے یہ میرا بڑا ہمدرد ہے ——— گویا وہ صفتِ احسان و فلاح کو مطلوب قرار دے رہا ہے۔

۸۔ انسان کہتا ہے یہاں مجھے بڑا آرام ملتا ہے ——— گویا وہ صفتِ طمانیت کو مطلوب قرار دے رہا ہے۔

۹۔ انسان کہتا ہے میں بڑا آدمی ہوں ——— گویا وہ صفتِ عظمت کا اثبات چاہتا ہے۔

۱۰۔ انسان کہتا ہے یہ بہت محترم ہستی ہے ——— گویا وہ صفتِ تقدیس کا اثبات کر رہا ہے۔

۱۱۔ انسان کہتا ہے مجھے اس سے محبت ہے ——— گویا وہ صفتِ محبوبیت کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔

۱۲۔ انسان کہتا ہے کاش میں بھی اس جیسا ہوتا ——— گویا وہ صفتِ مثالیت کا اعتراف کر رہا ہے۔

صرف یہ بات نہیں ہے کہ انسان مثبت انداز میں ان اقدار کا طالب رہتا ہے بلکہ وہ ان اقدارِ حیات سے دوری اور محرومی کو اپنے لیے رنج و غم کا سبب تصور کرتا ہے۔

۱۳۔ بعض دفعہ انسان شرمندہ ہو جاتا ہے ——— گویا وہ خود کو صفتِ مطلوب سے گرا ہوا تصور کرتا ہے۔

۱۴۔ بعض دفعہ انسان کو حیا مانع آتی ہے ۔۔۔۔ یعنی وہ خود کو معیارِ مطلوب سے گرانا نہیں چاہتا ہے۔

دُنیا کی غالب اکثریت کے نزدیک جمہوریت مقبولِ عام نظامِ حیات ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اس نظام میں چند اخلاقی اقدار (اہمیت فرد، مساوات، آزادی وغیرہ) کے حصول کو ہدف بنایا گیا ہے۔ دُنیا کے خاصے بڑے حصے میں اشتراکیت مقبولِ عام نظامِ حیات ہے۔ اس نظام میں بھی چند اخلاقی اقدار (مساوات، بنیادی ضروریات کی فراہمی، محنت کی قدر وغیرہ) کے حصول کو ہی ہدف بنایا گیا ہے۔ جمہوری اقدار ہوں یا اشتراکی اقدارِ حیات، دونوں جگہ عقلِ وجدانی کی عطا کردہ ہیں۔ طبعی دُنیا ہو یا حیاتیاتی دُنیا، کہیں بھی نہ مساوات ہے نہ آزادی نہ فراہمی ضروریات ہی۔ اس لیے عقلِ تجرباتی ان اقدار کا استنباط کرنے سے قاصر تھی۔ عقلِ وجدانی نے جذبۂ اندرون سے ان اقدار کو عطا کیا ہے یہ اقدار بھی پرتو صفاتِ حق ہیں۔ یہ اقدار عقلِ استدلالی کی استنباط کردہ نہیں ہیں۔

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ جب بھی کوئی عمومی انداز کی بات کی جاتی ہے وہ کسی نہ کسی مثبت اقدارِ حیات کا حصول ہوتی ہے۔ حکمران اور سیاستدان کتنے ہی ظالمانہ اور خود غرضانہ افعال و حرکات کے مرتکب ہوں مگر عوام کے سامنے جب وہ بیان دیتے ہیں تو ہمیشہ کسی نہ کسی اقدارِ حیات کے حصول کو اپنا مقصود و مطلوب بتاتے ہیں۔

آیئے تاریخ کے آئینہ میں قومی رہنماؤں کے ذمہ دار بیان پڑھیے۔

۱۔ "ایشیا اور افریقہ پر قبضہ کرنے سے ہمارا مقصود یہاں کی اقوام کو تہذیب و تمدن سکھانا ہے سفید فام اقوام کا یہ اخلاقی فریضہ ہے" (WHITE MAN'S LONDON)

اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے انگریز حکمران اپنی فتوحات کی یہ توجیہہ پیش کرتے تھے۔

۲۔ "چونکہ یہودیوں نے جنگِ عظیم اوّل میں وطن سے غداری کی تھی اس لیے ہم نے اس جنگ میں بخیالِ حفاظت یہودیوں کو علیحدہ کیمپوں میں رکھا ہے" ہٹلر

واضح رہے کہ ان کیمپوں میں چھ لاکھ یہودیوں کو اذیت ناک طریقوں سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔

۳۔ "یہ سب لوگ (کریمیا کے مسلمان) ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے اس لیے احتیاطاً ہم نے ان کو سائبیریا میں آباد کر دیا ہے"۔ اسٹالن

واضح رہے کہ سات صدیوں سے آباد ترک قبائل کو ان کے وطن کریمیا سے اکھاڑ کر سائبیریا کے

برفستانوں میں پھینک دیا گیا، جہاں وہ ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے۔

۴۔ "کالوں کے اختلاط سے سفید فام آبادی کے معاشرہ میں فساد رونما ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے کالوں کے لیے جداگانہ رہائش گاہ (GHETTO) مہیا کر دی ہیں"۔ وزیر اعظم جنوبی افریقہ

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں سیاہ فام آبادی کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔

۵۔ "چونکہ مسلمان قومی دھارے کے ساتھ نہیں چلتے، اس لیے اُن کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے وقتاً فوقتاً فسادات رونما ہو جاتے ہیں"۔ وزیر اعظم ہندوستان

۶۔ "علاقہ کے سیاسی توازن میں تغیرات رونما ہو جانے کے بعد اپنے تحفظ کے لیے ہم نے افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دی ہیں"۔ وزیر اعظم روس

۷۔ "ہم نے عراق کا ایٹمی اڈہ اصول خود حفاظتی کے تحت تباہ کیا ہے اور آئندہ بھی ہم ایسا ہی کریں گے"۔ وزیر اعظم اسرائیل

ان تمام بیانات میں سیاست دانوں نے اپنے ظلم و ستم کو کسی نہ کسی اخلاقی قدر کی آڑ میں چھپایا ہے گویا اُن کی کوشش اخلاقی اقدار کا حصول ہے نہ کہ ظلم و ستم۔ جعلی سکوں کو بازاروں میں چلنے کے لیے اصلی سکے سے پوری پوری مشابہت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ جھوٹ کو ہمیشہ سچ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اُوپر کے بیانات میں ظلم و ستم کو اخلاق کا لبادہ اوڑھنا پڑا ہے۔ کیا یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت نہیں ہے کہ انسانی معاشرہ میں ہر جگہ سکۂ رائج الوقت اخلاق ہے اور اخلاقی اقدار ہیں نہ شہوتِ شکم ہے، نہ شہوتِ جنس ہے نہ جلب منفعت ہے نہ دفع مضرت۔

انسان کی عملی زندگی کے ان مختلف افعال اور اقوال پر غور کیجیے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ مثبت اخلاقی اقدار کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے اور منفی اقدار سے ہمیشہ گریزاں رہتا ہے۔ ہر دم اس کے پیش نظر اخلاقی اقدار کا حصول رہتا ہے۔ انسانی زندگی کی تگ و تاز کے پس پردہ محرک یہی اخلاقی اقدار کا حصول ہے۔ یہ اقدار حقیقتِ کبریٰ کا پرتو ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ انسان عملاً پرتوِ حقیقتِ کبریٰ کا متلاشی رہتا ہے۔ وہ لاشعوری طور پر پرتوِ صفاتِ حق کا شناسا ہے۔ تلاش حقیقت کا جو تخم روز ازل انسانی سرشت میں پیوست کیا گیا تھا، وہ رائگاں نہیں گیا۔

وہ ہر دم ظہور رہنا چاہتا ہے۔ اس کا ظہور روزمرہ کی زندگی میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس کو حاسۂ مذہبی بھی کہتے ہیں۔ عقلِ کلی اور عقلِ وجدانی اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

یہ نکتہ یہاں خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہے کہ یہ اقدارِ عالیہ جو انسانی زندگی کی غایات ہیں۔ یہ ہرگز مادی الاصل نہیں ہیں۔ بلکہ یہ دل کی دنیا کی فتوحات ہیں۔ ان کو خارجی مادی ماحول نے انسانی ذہن پر مسلط نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ سائنسی اور دوسرے علوم کا حال ہے۔ بلکہ یہ اقدار انسان کے اندرونی وجدان کی عطا کردہ ہیں۔ یہ مادی کائنات کے انکشافات نہیں ہیں۔ یہ دل کی کائنات کے انکشافات ہیں۔ ان کا مصدر انسان کے باطن میں ہے۔ البتہ خارج میں ظاہر ہونے کے متمنی رہتے ہیں۔ انسان خارجی دنیا کی صورت گری اپنے باطنی تصورات سے منت کرنا چاہتا ہے۔ وہ خارجی ماحول کو اقدارِ عالیہ کے سمت بنانا، سدھارنا اور سنوارنا چاہتا ہے۔ وہ خارجی ماحول کو اقدارِ عالیہ کے ماحول کے مطابق چاہتا ہے۔ حکمائے یورپ کی غلط بینی قابلِ افسوس ہے۔ کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو انسان کو اور دل کو مادہ کی پیداوار بتلاتے ہیں۔ وہ دل کی دنیا کا انکار کرتے ہیں۔ دل مادہ کا محکوم نہیں ہے بلکہ وہ مادہ پر حکمران ہے۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

ادارہ

اِسلام کا شُورائی نظام

از جناب پروفیسر محمد یوسف فاروقی صاحب

(۲)

مشورہ لینا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "وشاورھم فی الامر" کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایجابی حکم نہ تھا بلکہ محض اس لیے تھا کہ صحابہ کرام سے مشورہ کر لیا کریں تو اُن کا دل بھی خوش ہو جائے گا اور اُن کی عظمت کا بھی اظہار ہو جائے گا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ حکم صرف دل خوش کرنے کے لیے نہ تھا۔ بلکہ اُن کی رائے سُننے اور صحیح مشورہ پر عمل کرنے کے لیے تھا، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح عمل فرمایا کہ غزوۂ بدر میں حضرت منذر بن عمروؓ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے لشکر کے پڑاؤ کی جگہ کا انتخاب کیا۔ غزوۂ احد میں جب اکثریت نے شہر سے باہر نکل کر جنگ کا مشورہ دیا تو آپ نے اُسے قبول فرمایا۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ غزوۂ احد میں جن لوگوں نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اُن کا مشورہ ٹھیک نہیں تھا۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ ان حضرات کا مشورہ بالکل درست تھا، اس غزوہ میں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا اُس کی وجہ ایک دوسری حربی غلطی تھی نہ کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا۔ غزوۂ احزاب[1] میں جب مدینۂ منورہ کا محاصرہ شدت اختیار کر گیا اور مسلمانوں پر حالات بہت سخت ہو گئے تو رسول اللہؐ نے قبیلۂ غطفان کو توڑنے کے لیے مدینہ منورہ کی پیداوار کے تہائی حصّہ پر مصالحت کا ارادہ فرمایا، اور اس معاملہ میں سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ سے مشورہ فرمایا لیکن ان دونوں نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ بلکہ کہا کہ ہم اخیر وقت تک مقابلہ کریں گے

---

[1] غزوۂ احزاب میں خندق کے ایرانی طریقے کو اختیار کرنا بھی مشورے کے تحت ہوا۔ (مدیر)

اور مدینہ منورہ کی پیداوار کا کوئی حصّہ انہیں دے کر مصالحت نہیں کریں گے، اُن کے مشورہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی رائے پر عمل کیا[۱]۔ اسی طرح ان تمام اجتماعی معاملات میں جن کے بارے میں کوئی حکم بذریعہ وحی نازل نہیں ہوتا تھا، آپ مشورہ فرماتے تھے۔ مسند احمد کی ایک روایت ہے۔

لَوْكُنْتُ مُؤَمِّرًا أَحَدًا دُوْنَ مَشُوْرَةِ الْمُؤْمِنِيْنَ لَأَمَّرْتُ ابْنَ أُمِّ عَبْدٍ"۔

"اگر میں مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کو امیر مقرر کرتا تو ابن ام عبد (حضرت عبداللہ بن مسعود) کو امیر مقرر کر دیتا[۲]"

ابوبکر جصاص بھی یہی رائے رکھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے ان حضرات کا سختی سے رد کیا جو اس بات کے قائل ہیں کہ صحابہ کرام سے مشورہ تو کیا جائے لیکن ان کی رائے کو قبول کرنا ضروری نہیں، ------

------ ذرا سوچیے یہ تو دل دکھانے والی بات ہوئی نہ کہ دل خوش کرنے والی۔ نہ ہی اس صورت میں اُن کی عظمت اور بلندی مرتبت کا اظہار ہوتا ہے کہ آپ اُن سے رائے تو لیں لیکن اُس پر عمل نہ کریں[۳]۔

شوکانی کی بھی یہی رائے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مشورہ کرنا ضروری تھا، وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام سے مشورہ فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مشورہ کرنے کا حکم دیا تھا[۴]۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے تو یہی بات واضح ہوتی ہے کہ آپؐ مشورہ لیتے اور اُس پر عمل فرماتے۔ آپؐ نے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک فرمایا تھا کہ:

"لو اجتمعتما في مشورة ما خالفتكما"۔

یعنی تم دونوں جس رائے پر متفق ہو جاؤ گے میں اس کے خلاف نہیں کروں گا[۵]۔ اسی آیت مبارکہ میں

---

[۱] شبلی، سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۴۲۵

[۲] ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون۔ جلد ۱ ص ۸۴

[۳] جصاص، احکام القرآن جلد ۲ ص ۴۹

[۴] الشوکانی، محمد بن علی بن محمد، فتح القدیر جلد ۴

[۵] ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم جلد ۱ ص ۴۲۰

آگے یہ الفاظ ہیں "فاذا عزمت فتوکل علی اللہ" لفظ عزم کی تفسیر کے بارے میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عزم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

"مشورۃ اہل الرائے ثم اتباعھم"

یعنی اہل الرائے سے مشورہ کرنا پھر اس کی پیروی کرنا۔ اس حدیث مبارکہ میں "ثم اتباعھم" نے بات بالکل واضح کر دی ہے کہ مشورہ پر عمل کرنا واجب ہے[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ عزم و اعتماد کی کیفیت بھی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب لوگوں سے مشورہ کیا جائے اور جو بات باہمی مشورہ سے طے پا جائے، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس پر عمل کیا جائے۔ امام قرطبی اس آیت کی تفسیر سے ابن عطیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ:-

"الشوریٰ من قواعد الشریعۃ وعزائم الاحکام" (یعنی شوریٰ عزائم احکام اور شریعت کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے[2])

یہ بات یقینی ہے کہ جو چیز دین کی بنیاد اور اصول ہو اس کو برقرار رکھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوگا۔ ابن خویز منداد کی یہ رائے قرطبی اور شوکانی نقل کرتے ہیں کہ حکمرانوں پر مشورہ کرنا واجب ہے۔ اور یہ کہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ ایسے حکمرانوں کو معزول کر دینا واجب ہے جو اہل علم و دین سے مشورہ نہیں کرتے[3]۔

اس بات پر تو سب ہی کا اتفاق ہے کہ حکمرانوں پر فرض ہے کہ ملکی معاملات باہمی مشورہ سے طے کریں۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اگر حکومت کوئی مجلس شوریٰ بناتی ہے یا کوئی مشاورتی کونسل تشکیل کرتی ہے تو اس کے مشوروں کی حیثیت کیا ہوگی؟ آیا حکومت مجلس شوریٰ کے مشوروں کی پابند ہوگی یا نہیں؟

ہم نے سطور بالا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اس پہلو کو بیان کیا ہے کہ آپؐ صحابہ کرامؓ کے مشوروں پر عمل فرماتے تھے۔ یہی بات اس آیت مبارکہ سے بھی ثابت ہو رہی ہے۔ "فاذا عزمت"

---

[1] ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم جلد ۱ ص ۴۲۰

[2] القرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد، الجامع الاحکام القرآن جلد ۴ ص ۲۴۹

[3] القرطبی، الجامع الاحکام القرآن جلد ۱ ص ۲۴۹، الشوکانی، فتح القدیر جلد ۱ ص ۳۶۰

کی جو تفسیر حضرت علیؓ کی روایت سے ثابت ہے اُس کی روشنی میں ایک بات طے ہے کہ حکومت شوریٰ کے مشوروں کی پابند ہوگی۔ ابوبکر جصاص بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "وفی ذکر العزیمه عقب المشاورة دلالة علیٰ انها صدرت عن المشورة" عزیمت کو جو مشورہ کے بعد ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے یہ عزم مشورہ کا نتیجہ ہے۔[1] اسی بات کی تائید رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ سے ہوتی ہے، ان تمام معاملات میں جہاں وحی نہ ہو آپ مشورہ فرماتے اور اُس کے مطابق عمل فرماتے تھے۔ غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب کے موقعوں پر آپ کا مشوروں کے مطابق عمل درآمد فرمانا ہماری رائے کی تائید کرتا ہے۔ عہدِ خلفائے راشدین میں بھی یہی طریقہ رہا ہے۔ ہاں اگر کبھی حکومت اور اہلِ شوریٰ میں اختلاف پیدا ہوگیا ہو تو اپنے اپنے موقف پر دلالت و گفتگو کا سلسلہ جاری رہنا تھا حتیٰ کہ ایک فریق دوسرے کو اپنے موقف کا قائل کر لے۔ تب اس پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف کارروائی کا ارادہ فرمایا تو اہلِ شوریٰ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ کلمہ گو کے خلاف جنگی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے موقف کی تائید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث " امرت ان اقاتل الناس" الخ پیش کی۔ خلیفۂ وقت کے دلائل سن کر لوگ اُن کی رائے سے متاثر اور متفق ہوگئے تو اس پر عمل درآمد ہوا۔ اسی طرح جنگ یمامہ کے بعد جب عمرؓ فاروق نے صدیق اکبرؓ کو قرآن حکیم کو ایک کتابی شکل میں مرتب کرنے کا مشورہ دیا تو ابتدا میں ابوبکرؓ صدیق نے فاروق اعظمؓ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے رہے اور اُس کی اہمیت و ضرورت کو جتلاتے رہے، یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اُن کی رائے سے اتفاق کر لیا، اور پھر حضرت زیدؓ بن ثابت کو اس کام کے لیے مامور کیا۔

عالمِ اسلام کی مشہور شخصیت جسٹس عبدالقادر عودہ شہید بھی یہی موقف رکھتے تھے۔ اور وہ لکھتے ہیں کہ "شوریٰ بالکل بے مقصد ہو کر رہ جائے گی۔ اگر حکومت اکثریت کی رائے کو نہ مانے۔ امتِ مسلمہ پر شوریٰ کی فرضیت اس بات کی مقتضی ہے کہ اکثریت کی رائے تسلیم کی جائے۔ یہی بات سنتِ نبوی سے ثابت ہے۔"[2]

---

[1] جصاص، احکام القرآن جلد ۲ ص ۵۰

[2] عبدالقادر عودہ شہید، الاسلام واوضاعنا السیاسیہ، ص ۱۶۲

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "ید الله علی الجماعة" "اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے۔ اسی طرح" ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن" جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ یہ احادیث بھی ہمارے موقف کی تائید کر رہی ہیں۔ قرآن کریم کی اس آیت کو بھی ہم اپنے موقف کی تائید میں پیش کر سکتے ہیں۔ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا - جو شخص اللہ کے رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسری چلنے لگے تو ہم اس کو اسی طرف لے جائیں گے جس طرف کہ اس نے جانا پسند کیا ہے۔ اور اسے دوزخ میں پہنچادیں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے[1]۔

اس آیت میں وارد ہوئے الفاظ "ويتبع غير سبيل المومنين" قابل غور ہیں جو ہمارے موقف کی تائید کر رہے ہیں۔

ارکانِ شوریٰ کی اہلیت عہد نبوی اور خلفاے راشدین میں شوریٰ کے ارکان وہ حضرات ہوتے تھے جو اسلام میں سابقین اولین ہوتے تھے اور جن کی دینِ اسلام کے لیے خدمات اور قربانیاں زیادہ ہوتی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی مملکت صرف اس لیے وجود میں آتی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا دین غالب ہو، سارا معاشرہ اور معاشرہ کے تمام ادارے اسلامی تعلیمات اور اس کی روح کے مطابق کام کریں۔ ایسے معاشرہ میں وہ افراد ہی قیادت و رہنمائی کے مستحق ہیں جنھوں نے دین کے لیے زیادہ سے زیادہ قربانیاں دی ہوں، اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے پر خلوص جدوجہد کی ہو، جن کی دیانت نیکی اور تقویٰ شکوک و شبہات سے بالاتر ہو، آج بھی مجلسِ شوریٰ کے ارکان کا انتخاب کرتے ہوئے اسی چیز کو معیار بنانا چاہیے۔ یا کم از کم ایسے افراد ہوں جس کی دینِ اسلام کے ساتھ وابستگی ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بالاتر ہو۔ یہ تو وہ معیار ہے جس کو ہمارے اسلاف نے نہ صرف ارکانِ شوریٰ کے لیے ضروری تصور کیا ہے۔ بلکہ تمام سیاسی اور انتظامی عہدوں کے لیے بھی اس کو معیار قرار دیا ہے۔ علامہ آلوسی مرحوم نے اس کے علاوہ دو صفتوں کا ذکر کیا ہے جو ارکانِ شوریٰ کے لیے ضروری ہیں۔

---

[1] النساء، آیت ۱۱۵

ایک یہ کہ وہ ذہین و عقل مند ہوں اور دوسرے یہ کہ صالح و دیندار ہوں۔[۱] حضرت سفیان ثوریؒ سے مشیر کی اہلیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ "لیکن اھل مشورتك اھل التقوی والامانة ومن یخشی اللہ تعالیٰ"۔ "آپ کے مشیر متقی، امانت دار اور خوفِ خدا رکھنے والے ہونے چاہئیں۔"[۲]

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اگر دینی مسائل یا احکام سے متعلق مشورہ درکار ہو تو مشاورتی کونسل کے ارکان دیندار علماء ہوں، لیکن اگر دیگر معاملات سے متعلق مشورہ کی ضرورت ہو تو پھر تجربہ کار، زیرک اور مشورہ لینے والے (اسلامی حکومت) کے ساتھ خلوص و محبت کے جذبات رکھنے والے افراد ہوں۔[۳]

مشیروں میں امانت داری کی صفت کی طرف حدیث نبوی میں بھی اشارہ ملتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ "المستشار موتمن"۔

جسٹس عبدالقادر عودہ شہید رحمۃ اللہ علیہ نے درج ذیل تین اوصاف کا ذکر کیا ہے:-

۱۔ عدالت:- عدل سے مراد وہ فرد ہے جس کی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو، فرائض کا پوری طرح پابند ہو، فضائلِ اخلاق سے اُس کی زندگی آراستہ ہو اور معاصی و بداخلاقیوں سے اجتناب کرتا ہو۔

۲۔ علم:- دوسری صفت اہلِ شوریٰ کے لیے علم ہے۔ یہاں علم اپنے وسیع مفہوم میں مستعمل ہے، دینی علوم کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشی اور تجرباتی علوم بھی داخل ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ شوریٰ کا ہر رکن علم کے ہر شعبہ میں ماہر ہو بلکہ کسی ایک شعبہ میں بھی وسعتِ نظر کافی ہے۔ مثلاً علم طب، ریاضی وغیرہ، یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام کے تمام اہلِ علم درجۂ اجتہاد پر فائز ہوں بلکہ اکثریت میں اجتہادی بصیرت کافی ہے۔

۳۔ حکمت و رائے:- تیسری شرط یہ ہے کہ یہ ارکان صاحب الرائے ہوں، صاحب الرائے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تجربہ کار اور معاملہ فہم ہوں۔ ملکی اور ملی معاملات میں اپنی آزادانہ رائے دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ لوگ صاحبِ حکمت بھی ہونے چاہئیں، حالات کو سمجھتے ہوں اور زمانہ کی نبض پر انگلیاں رکھتے ہوں، تاکہ مسائل و مشکلات کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر سکیں۔[۴]

۱۔ آلوسی، روح المعانی۔ جلد ۲۵ ص ۴۶

۲۔ الجامع الاحکام القرآن جلد ۴ ص ۲۵۱ ۳۔ ایضاً ص ۲۵۰

۴۔ عبدالقادر عودہ، الاسلام و اوضاعنا السیاسیہ، ص ۱۴۸۔

اِسلام ـــــ مکمّل اِنسانی مساوات کا علمبردار

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

حضور اکرمؐ کے برپا کردہ اسلامی انقلاب نے تمام انسانوں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا اور وہ سطح تھی انسانیت کی سطح۔ ابن آدم ہونے کی حیثیت سے آدمی کی سطح اور خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے بندگی کی سطح ــــ یہ وہ مساوی اور برابر کی سطح تھی جس پر اس سے پہلے سارے انسانوں کو کبھی کھڑا نہیں کیا گیا تھا ــ حضورؐ کے انقلاب کا یہ حیرت انگیز معاشرتی اور انسانی پہلو تھا۔ پہلی بار آدمؑ کے بیٹوں کو مساوی انسانی حقوق ملے تھے۔

جب سے انسان زمین پر آیا تھا، اُس نے اپنی امتیازی شان بنانے کے لیے بیسیوں وجوہِ امتیاز پیدا کر لیے تھے۔ سارے انسانوں کے پاس یکساں اعضاء انسانی تھے۔ اُن کی عمومی قوتیں اور صلاحیتیں بھی برابر سی تھیں۔ عام حالات میں جس طرح کسی بکری کو دوسری بکریوں پر اور کسی شیر کو دوسرے شیروں پر فضیلت دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی اسی طرح انسانوں میں بھی ایک انسان کو دوسرے انسان پر ترجیح و فضیلت کی بظاہر کوئی وجہ نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اشرف المخلوقات انسان نے جہاں اور بہت سی پستیاں اپنے اندر قبول کیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ بتدریج ایک دوسرے کے مقابلے میں بلندی و پستی، فضیلت و عدم فضیلت اور امتیازاتِ اعلیٰ و ادنیٰ کا شکار ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بعض انسان دوسرے انسانوں کے مقابلے میں اپنی خدائی کے دعوے کرنے لگے۔ ذرا سی اجتماعی قوت و اقتدار نصیب ہوا اور ذرا سا حکم چلنے کا امکان پیدا ہوا تو انسان اپنے بارے میں اس غلط فہمی میں پڑ گیا کہ وہ عام انسانوں سے فائق تر کوئی بڑی چیز تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ دوسرے انسان اُس کے مقابلے میں بہت پستی اور ذلت کے مقام پر کھڑے تھے۔ پھر دوسرے انسانوں نے بھی اُسے یقین دلایا کہ واقعی اس میں ایسی

خوبیاں موجود نہیں کہ دوسروں کے مقابلے میں اسے اشرف و اعلیٰ و ارفع قرار دیا جائے ۔

بتدریج اس شرف و رفعت کے لیے کئی پیمانے وضع ہوتے چلے گئے ۔ خاندانی نسب کا شرف ، نسل و خون کی رفعت ، رنگ کی خوبی ، تعلیم کی بلندی ، عہدہ و منصب کا امتیاز اور ان امتیازات کے نتیجے میں لگا کہ انسان نے بادی النظر میں اپنے آپ کو دوسروں سے بلند ثابت کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ۔ یہ جاہلی جذبہ اس قدر قوی نکلا کہ انسان میں اوّل روز سے اس کے ساتھ ساتھ چلا آتا ہے اور جو بات ابلیس آدم کے مقابلے میں کہہ کر مستقل راندہ گیا تھا ۔ وہی بات انسان اپنے ہی بھائی بندوں کے مقابلے میں مختلف پیمانوں سے کہتا رہتا ہے ۔ اور ساتھ ہی یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ اس کی فضیلت کو تسلیم کیا جائے اپنی فضیلت کا ایسا ہی جھگڑا ابلیس نے بھی اپنے رب سے کیا تھا ۔

ظاہر ہے کہ ہر اجتماعیت میں فرد کے لیے ایک معیارِ فضیلت ہوتا ہے جس کو اختیار کر کے کوئی فرد شرف حاصل کرتا اور ترک کر کے ذلت سے دوچار ہوتا ہے ۔ عالمگیر سچائیاں بلاشبہ سب کے لیے اعزاز کا مشترک سرمایہ ہوتی ہیں ۔ لیکن اس معاملہ میں بھی اسلام اور کفر کے تصورات شرف و اعزاز اور معیارِ فضیلت میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور یہ فرق الٰہی ہدایات سے فیض یاب ہونے یا ان ہدایات سے محروم ہونے کا فرق ہے ۔ کفر اور جاہلیت نے فضیلت کے بے شمار معیار مختلف ادوار اور مختلف معاشروں میں قائم کیے ، لیکن اسلام فضیلت کے ان لاتعداد معیاروں کے ڈھیر پر ایک قلم غلط تنسیخ کھینچ دیتا ہے اور وہ اپنا ایک نرالا فلسفۂ فضیلت اور نرالا ہی معیارِ بزرگی رکھتا ہے ۔ وہ تمام پیچ و پیچ اور فضیلت کے جاہلی بودے پیمانوں کو توڑ کر اپنا الگ پیمانہ پیش کرتا ہے ۔ وہ عین اس عالم وجود کے وسط میں حیاتِ انسانی کے سینے پر اپنا میزانِ فضیلت ان الفاظ میں گاڑ دیتا ہے ۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

(تم میں سب سے معزز وہی ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا ہے)

یہ ایک الٰہی اصولِ فضیلت اور معیارِ بزرگی ہے ۔

حضورؐ نے فرمایا :

" پرہیزگاری کے سوا اور کسی چیز کی بنا پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر فضیلت نہیں ہے ۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے ۔"

فرمایا:

"نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر، تم سب آدم کی اولاد ہو"

فتح مکہ کے موقع پر فرمایا:

"سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے اِن قدموں کے نیچے ہے"۔

پھر فرمایا:

"اے لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ نسب کے لیے کوئی فخر نہیں ہے، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں ہے، تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے"۔

حضورؐ کے پیش کردہ اسلامی نظام حیات نے فضیلت کے تمام غیر الٰہی نظریات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ نسل کے بت پر اس نے یہ کہہ کر ضرب لگائی۔

خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونساءً (النساء)

"خدا نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا"۔

مزید ارشاد ہوا:۔

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، در حقیقت تم میں سب سے معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے"۔ (سورہ الحجرات)

حضورؐ نے فرمایا:

"جس نے عصبیت پر جان دی، وہ ہم میں سے نہیں، جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں، جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں"۔

مزید فرمایا:۔

"وہ شخص ہم میں سے نہیں جو لوگوں کو عصبیت کی طرف بلاتا ہے"۔

غرض بحیثیت انسان اور آدم کی اولاد ہونے کے اسلام میں کسی شخص کو کسی دوسرے شخص پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اسلامی معاشرے میں انسان کے بنیادی حقوق سب کے لیے مساوی اور برابر ہیں۔ اسلامی نظام میں کسی کے بچوں کو اس لیے بہترین تعلیمی اور رہائشی سہولتیں میسر نہیں آسکتیں کہ وہ بچے امیر المومنین کے بچے ہیں۔ اور کسی کے بچے صرف اس لیے گلیوں میں خاک چھانتے نہیں پھر سکتے کہ وہ کسی غریب کی اولاد ہیں۔ اسلام میں ہر فرد کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ تمام امتیازات سے قطع نظر اپنا انسانی حصہ وصول کرے اور اپنے طبعی جسم کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی ضروریات کو حاصل کرے۔ ریاست کے قانون میں دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

خاندان اور قوم کے فخر کے غباروں میں سے بھی اسلام نے ہوا نکال دی۔ حضورؐ نے فرمایا:

"اے عبدالمطلب کی اولاد اپنے نفسوں کو آگ سے چھڑاؤ، کیونکہ میرا رشتہ تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔" پھر فرمایا "اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ دوزخ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر، کیوں کہ میرا رشتہ تجھ کو خدا کے ہاں مفید نہیں ہو سکتا۔"

حضورؐ کے برپا کردہ اسلامی انقلاب کے پیش نظر صالح افراد کو چن چن کر اوپر لانا ضروری تھا، تاکہ وہ دنیا میں اصلاح کریں۔ اور امن قائم کریں، انسانوں کو انسانیت کا سبق دیں۔ تقویٰ کے اس معیار پر اگر حبشی بھی پورا اترتا تھا تو وہی اوپر آنے کا حقدار قرار پاتا۔ حضورؐ نے فرمایا:

"سنو، اگر تم پر نکٹا حبشی بھی امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہیں چلائے تو اس کی بات ماننا اور اطاعت کرنا۔"

حضورؐ نے کسی فاجر کی قیادت قبول کرنے سے بھی منع فرما دیا:

"کوئی اجڈ گنوار کسی مہاجر کا امام نہ بنے اور نہ کوئی فاجر شخص کسی پارسا مومن کا۔"

قرآن میں فرمایا گیا:

لاتتخذوا اٰبآءکم واخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان ومن یتولھم منکم فاولٰئک ھم الظلمون

"اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی دوست اور محبوب نہ رکھو، اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو محبوب رکھیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو محبوب رکھے گا وہ ظالموں میں شمار ہوگا۔"

فرمایا گیا.....

" سو اپنے عہد کو پورا کریں اور اللہ تعالیٰ سے ڈریں تو اللہ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ مالک کا حکم ہوا " اے محمدؐ کہو کہ میری نماز اور میرے تمام مراسم عبودیت، میرا مرنا، میرا جینا سب کچھ اللہ کے لیے ہے اور سب سے پہلے میں اس کی اطاعت میں سر تسلیم خم کرتا ہوں "

آقا نے فرمایا.....

" اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے " (سورۂ بقرہ)

اللہ سے ڈرو وہ جلد حساب چکانے والا ہے "۔ (سورہ مائدہ)

حضورؐ کی معرفت ملنے والے یہ احکام انسان کو اس کے معیارِ فضیلت کی طرف بلاتے ہیں۔ چنانچہ اس معیار سے ہٹ کر اگر کوئی یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اسے جہنم کی آگ نہ چھوئے گی یا فلاں بزرگ سے اس کا رشتہ ہے اس لیے وہ اسے بخشوا لیں گے تو اس قسم کا فالج زدہ تقویٰ شاید ہی خدا کی میزانِ عدل میں کوئی وزن پا سکے۔ اصل تقویٰ تو وہی ہے کہ انسان کی زندگی کا اندر اور باہر ان حدود کے اندر رہے جو خدا اور اس کے رسول نے مقرر فرما دی ہیں۔ اور ایسا ہی تقویٰ حضورؐ نے اپنے صحابہؓ کو سکھایا تھا۔

چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعب سے تقویٰ کا مفہوم پوچھا۔ انہوں نے فرمایا: امیر المومنین آپ کسی ایسے راستے سے گذرے ہیں جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں"؟

حضرت عمرؓ نے فرمایا: " ہاں"

حضرت ابیؓ نے پوچھا "آپ وہاں سے کیسے گذرتے ہیں؟

حضرت عمرؓ نے فرمایا: " دامن کو سمیٹ کر اور بچا کر گزر جاتا ہوں۔

حضرت ابی نے فرمایا: " یہی تقویٰ ہے "۔

گویا تقویٰ یہ ہے کہ انسان خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے بچ بچ کر حدودِ شریعت کے اندر رہتا ہوا زندگی گذارے۔ اس طرح اسلام نے فضیلت و بزرگی کے تمام جاہلی پیمانوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ اور اپنے نئے معیارِ فضیلت پر جو سوسائٹی تعمیر کی اس میں ایران کے مسلمان بھی تھے جو اپنے آپ کو

ان اسلام کہتے تھے اور جن کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں - ان ہی بازانؓ بھی تھے جن کا نسب شاہانِ ایران سے جا ملتا تھا - ان ہی حبشہ کے بلالؓ بھی تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ :

"بلال ہمارے آقا کے غلام اور ہمارے آقا ہیں"۔

ان میں روم کے صہیبؓ بھی تھے جنہیں حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ امامت کے لیے کھڑا کیا تھا - ان ہی حضرت ابو حذیفہؓ کے غلام حضرت سالمؓ بھی تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا تھا کہ :

"آج وہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلافت کے لیے نامزد کرتا"۔

ان میں زید بن حارثہ ایک غلام بھی موجود تھے جنہیں رسول کریمؐ نے ایسے لشکر کا سردار بنایا تھا ، جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے صحابہ بھی موجود تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا کہ :

"اسامہ تجھ سے اور اس کا باپ تیرے باپ سے افضل ہے"۔

فتح مکہ کے موقع پر خود قریش نے قریش پر غلبہ حاصل کیا تھا اور ایک اعلیٰ تر مقصد کے لیے خود اپنوں کو مغلوب کیا تھا -

ایک غزوہ میں عبداللہ بن ابی مشہور منافق نے کہا "بخدا مدینہ پہنچ کر جو ہم میں عزت والا ہوگا ، وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا"۔ اور جب اس بات کی خبر اس کے لڑکے حضرت عبداللہؓ کو ہوئی تو انھوں نے مدینہ پہنچ کر باپ کا راستہ روک لیا اور تلوار سونت کر کہا کہ :

"تو مدینہ میں نہیں گھس سکتا جب تک رسول اللہؐ اجازت نہ دیں تو کہتا ہے کہ جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا تو تجھے معلوم ہو کہ عزت صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہے"۔

حضورؐ کے حکم پر ہی انہوں نے اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے دیا -

ایک موقع پر جب کہ حضورؐ قریش کے کچھ سرداروں کو دعوتِ اسلام دے رہے تھے اور اس مجلس میں ابوجہل ، عتبہ اور شیبہ جیسے اکابر قریش بھی تھے کہ حضرت ابن مکتوم نابینا صحابی تشریف لائے اور حاضرین کو نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا - حضورؐ نے سردارانِ قریش کو دعوتِ اسلام

دینے کے خیال سے حضرت ابن مکتوم کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس پر یہ تادیبی آیات نازل ہوئیں۔

یہ تھا وہ معاشرہ جو ان اکرمکم عند اللہ اتقکم کے اصول پر تعمیر ہوا تھا۔ اس اصول پر جب ایک اسٹیٹ وجود میں آیا تھا تو اس کے کارکن، اس کے جج، اس کے حاکم اور اس کے چپڑاسی تک بالکل مختلف نوعیت کے تھے۔ آج کا ایک جج بھی اپنے موجودہ اخلاق کے ساتھ اس اسلامی عدالت کا کلرک اور چپڑاسی بننے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اسلام جانی بوجھی ہوئی اچھائیوں اور نیکیوں کو معروف کا نام دے کر ان پر انسان کو اکساتا ہے اور جو لوگ اس مقصد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں انہیں بھلے آدمی اور متقی قرار دیتا ہے۔ اور اسی طرح وہ جانی بوجھی ہوئی برائیوں کو منکر کا نام دے کر انسانوں کو ان سے روکتا ہے اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کو برے لوگ اور فاسق و فاجر قرار دیتا ہے۔ یہی وہ میزانِ فضیلت ہے جو اسلام نے زمانے کے سینہ میں ہمیشہ کے لیے گاڑی ہے اور جسے اسی لیے تا قیامت قائم کر دیا گیا ہے تاکہ بنی نوعِ انسان اس میں اپنے آپ کو تول سکیں۔ اسی میں تول کر اپنے حاکموں اور نمائندوں کو مقرر کریں۔ اسی میں تول کر وہ کسی کو معزز قرار دیں اور کسی کو گرا ہوا سمجھیں۔

اسلام نے یہ اصول مقرر کر دیا کہ دنیا کے امن کے لیے اور فلاحِ انسانیت کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ لوگ آگے آئیں جو خدا سے ڈرنے والے اور آخرت میں جوابدہی کا پورا پورا احساس رکھنے والے ہوں جو نیک اور صالح ہوں۔ اور وہ لوگ پیچھے ہٹ کر رہیں۔ جنہوں نے اپنی ہوس کے سامنے فتنوں کے سارے دروازے کھول رکھے ہیں اور جن کے دماغوں کو شیطان نے اپنا گھونسلا بنا لیا ہو۔ اگر دنیا کو تباہی کی طرف جانے سے روکنا ہے اور اگر خدا کی زمین کو انسانی خون سے لالہ زار ہونے سے بچانا ہے۔ اگر مسلمانوں میں اپنے معروف کے علمبردار ہونے اور منکر کے ختم کرنے والے ہونے کا احساس باقی ہے اور خدا کے ہاں جوابدہی کا تصور بھی موجود ہے تو پھر ہمیشہ کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ لوگ جو خدا کی مقرر کردہ اس میزانِ فضیلت کو قائم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔ اور اس معیارِ فضیلت کو بالکل قائم کریں۔ جس دن یہ ہو گا اس زمین پر خدا کی مرضی اسی دن پوری ہو گی۔

حضورؐ نے اس معیار کے مطابق اپنے قائم کردہ معاشرے میں عزت و ذلت اور فضیلت و مسکنت کے پیمانے مقرر کیے تھے۔ اور اسی بدلے ہوئے معیار نے انسانیت کا معیار بدل ڈالا تھا اور لوگ معیارِ زندگی کی بجائے معیارِ انسانیت کو تلاش کرنے لگے تھے۔

حقیقتِ تصوّف

پروفیسر طیب شاہین لودھی صاحب

اکثر علماء کے نزدیک اسلام میں تصوّف کی ابتدا زہد سے ہوتی ہے۔ لیکن زہد و ورع کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کا تصور مسیحیت سے لیا گیا ہے جیسا کہ اکثر مستشرقین اس کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اسلام کے متعلق ان کے اکثر دعاوی محض تعصب پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کرم فرماؤں کی نام نہاد "علمی تحقیقات" ہمیشہ اپنے ساتھ تعصب لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ یہ حضرات اسلام کے بنیادی عقائد اور نظریات کے سرچشمہ کی تلاش عیسائیت، یہودیت، رومن قوانین میں اور خدا جانے کہاں کہاں کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس مفہوم کی بہت سی آیات ملتی ہیں جن میں دنیا کی زینت اور اس کے مال و متاع اور لذائذ کو عارضی قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ آخرت ہمیشہ رہنے والی چیز ہے۔ اسی طرح احادیث کے ذخیرے میں ایک معتدبہ حصہ زہد وغیرہ کی احادیث پر مشتمل ہے۔ متقدمین اصحابِ حدیث نے زہد و ورع کی احادیث کو اگرچہ کسی علیحدہ باب میں بیان نہیں کیا تاہم دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں زہد کی احادیث کو علیحدہ اور مستقل ابواب کی صورت میں جمع کیا جانے لگا تھا۔ بلکہ زہد کی احادیث علیحدہ کتابی صورت میں مدون ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ امام احمدؒ کی "کتاب الزہد"، عبداللہ بن مبارک، وکیع بن الجراح اور ہناد بن سری کی تصنیفات مشہور ہیں۔

صحابہ کرام خصوصاً سابقینِ اوّلین تزکیہ نفس کی تمام منزلوں سے گزر چکے تھے۔ زہد کی حقیقت اُن کے دلوں میں پوری طرح جاگزین تھی۔ انہیں زہد و ورع اور رہبانیت و ترکِ دنیا میں امتیاز و تفریق کا کامل شعور تھا۔ انہیں اس حقیقت کا بھی مکمل شعور تھا کہ سابقہ اُمتیں خصوصاً مسیحیت کس طرح افراط و تفریط

کی شکار ہوکر ترکِ دنیا کے غیر فطری راستوں سے ہوتی ہوئی رہبانیت کی دلدل میں پھنس گئی[1]۔ اور وہ قوم جو دنیا کا تزکیۂ نفس کرنے کے لیے برپا ہوئی تھی باطل فلسفیانہ نظریات سے اس قدر متاثر ہوئی کہ ایک اور قوم کی بھول بھلیوں میں صراطِ مستقیم کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھی۔ قرآن مجید میں عیسائیوں کی ان بدعات کا واشگاف انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لا رھبانیۃ فی الاسلام فرما کر نفس کشی، ترکِ دنیا اور ترکِ تناسل وغیرہ کا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند کر دیا۔

زہد کیا ہے؟ علماء اور اصحابِ تزکیۂ نفس سے زہد کی بہت سی تعریفیں منقول ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق زہد کی تعریف کی ہے۔ صوفیہ کی تعبیرات ان کے ذوق و احوال کی آئینہ دار ہیں۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں۔

"چیتھڑے پہننے اور موٹا جھوٹا کھانے کا نام زہد نہیں بلکہ دنیا کی قلتِ امید کا نام زہد ہے[2]"۔

ابن جلاءؒ کہتے ہیں:

"دنیا کو زوال کی آنکھ سے دیکھنے کا نام زہد ہے[3]"۔

یحییٰ بن معاذ کہتے ہیں:

"زہد مال کے ذریعے سخاوت پیدا کرتا ہے اور محبت روح میں سخاوت پیدا کرتی ہے[4]"۔

ابو سلیمان دارانیؒ نے ان الفاظ میں زہد کی تعریف کی ہے:

"زہد نام ہے ہر اس امر کے ترک کرنے کا جو اللہ تعالیٰ سے غافل کرتا ہے[5]"۔

جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:

"ملکیت سے ہاتھ کھینچ لینا اور دل کو اس کے تتبع سے روک دینا زہد ہے"۔

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ - سورۃ الحدید حواشی آیت نمبر ۲۷

[2] مدارج السالکین ۲ : ۱۰ [3] مدارج السالکین ۲ : ۱۱

[4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً

یہ ہیں زہد کے بارے میں علماء اور اصحابِ طریقت کے چند چیدہ اقوال۔ تمام اقوال کا مفہوم تقریباً ایک ہے۔ یعنی زہد دراصل نفس کی بے رغبتی کا نام ہے۔ قرآن مجید نے چند الفاظ میں زہد کی حقیقت بیان کر دی ہے۔ بقول ابن قیمؒ لسانِ علم سے نکلا ہوا کلام لسانِ ذوق سے نکلے ہوئے کلام سے زیادہ وسعت کا حامل اور برہان و دلیل سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت زہد کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے:

لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ؕ

"تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے اس پر تم افسوس نہ کرو اور جو چیز اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اترانے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔"

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید کے مذکورہ بالا مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"دنیا کے آنے پر عدم فرحت اور اس کے ہاتھ سے نکل جانے پر عدم حزن و تاسف زہد کہلاتا ہے۔"

ان سے پوچھا گیا۔ "ایک شخص کے پاس ایک ہزار دینار ہیں۔ کیا وہ زاہد ہو سکتا ہے؟" انہوں نے جواب دیا "ہاں! اس صورت میں کہ وہ ان کے زیادہ ہونے پر خوش نہ ہو اور کم ہونے پر غمگین نہ ہو۔"[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے زہد کی یہی حقیقت تھی۔

اسی مفہوم کو ابن تیمیہؒ نے الفاظ کا ایک اور ہی پیرایہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جو چیز آخرت میں فائدہ نہ دے اس کو ترک کرنا زہد کہلاتا ہے اور آخرت میں جس چیز کے ضرر کا خوف ہو اس کو چھوڑ دینا ورع کہلاتا ہے ۔۔۔ زہد و ورع کے باب میں

---

[1] سورۃ الحدید آیت نمبر ۲۳

[2] مدارج السالکین ۲: ۱۱

یہ مقولہ بہترین اور جامع ترین عبارت ہے [۱]"

امام احمدؒ نے زہد کے تین مدارج بیان کیے ہیں۔

اوّل: ترکِ حرام ۔ یہ عوام کا زہد ہے۔

دوم: حلال اور مباح اشیاء میں ترکِ فضولیات ۔ یہ خواص کا زہد ہے۔

سوم: ان تمام امور کو ترک کر دینا جو اللہ تعالیٰ سے توجہ ہٹاتے ہیں۔ اور یہ عارفین کا زہد ہے۔

زہد کا اسلامی تصور قرآن مجید کے حوالے سے ہم نے اصحابِ علم کے الفاظ میں زہد کا جو مفہوم بیان کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین کی پوری زندگی اس پر شہادت دیتی ہے۔ یہی زہد کا اسلامی تصور ہے۔ جو قرآن ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ زہد کا یہی وہ تصور ہے جو عجمی نظریات کی درآمد سے قبل قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں واضح طور پر موجود تھا۔

یہ زہد کا شعور ہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں جب سونے چاندی کے ڈھیر لگ گئے تو اس وقت بھی آپ کی حالت یہ تھی کہ اس دولت میں سے اپنی ذات پر ایک حبہ بھی خرچ نہیں فرمایا۔ مال کی آمد پر آپ کو کبھی فرحت نہیں ہوئی ۔ اس وقت بھی آپ نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا تناول نہیں فرمایا۔ اس وقت بھی آپ پیوند لگا لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی آپ کے گھر میں کئی کئی روز تک آگ نہیں جلتی تھی۔ اس دنیا سے تشریف لے جانے سے قبل گھر میں رکھے ہوئے چند درہم بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں تقسیم فرما دیے۔ آپؐ کی نظر میں سونے چاندی اور کنکر پتھر میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ یہی حال صحابہ کرام کا تھا۔ ان کے اذہان میں زہد اور ورع کا تصور بالکل واضح تھا اور وہ اس پر عامل بھی تھے۔ جب قیصر و کسریٰ کے تمام خزانے سمٹ کر مدینہ پہنچ گئے تو اس وقت بھی صحابہ کرامؓ کا یہ حال تھا کہ ان کا سب سے زیادہ باعزت شخص کھجور کے سایے میں پتھر کا تکیہ رکھ کر زمین پر سو جایا کرتا تھا۔ ان کی نگاہ بلند، قلب سوز و گداز سے لبریز اور ذہن ان تمام مقاصد سے کامل طور پر آگاہ تھا۔ جن کے لیے امتِ مسلمہ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ یہ مقاصد لمحہ بھر کے لیے

---

[۱] مدارج السالکین ۲ : ۱۰

کبھی اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام و تابعین کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلاشبہ انہوں نے زہد کو اختیار کیا۔ لیکن اپنے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے بقدرِ ضرورت دُنیا کو استعمال کرنے سے کبھی گریز نہیں فرمایا۔ وہ دُنیا سے فرار ہو کر جنگلوں اور صحراؤں میں نہیں نکل گئے۔ بلکہ انہوں نے افراط اور تفریط سے دامن بچاتے ہوئے طیباتِ رزق سے استفادہ کیا اور باطل اور ظلم و تعدّی کا دُنیا کے آخری کونے تک تعاقب کیا۔

قرآن مجید میں تزکیہ نفس کو انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ علیہم وسلامہ کی بعثت کا اوّلین مقصد قرار دیا گیا ہے۔ تمام انبیائے کرام کا طریقِ تزکیہ عام طور پر اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ تزکیہ خاص طور پر ان چار مقاصد پر مشتمل ہے۔

اوّل: اللہ تعالیٰ سے محبت کی تجرید۔

دوم: اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی۔

سوم: اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی تجرید۔

چہارم: باطل اور شر کے خلاف پیہم جدوجہد۔

اوّل الذکر تین مقاصد کو اخلاص فی العبودیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ [1] اور اسلام کا نظریۂ جہاد اسی مقصدِ چہارم کی عملی تعبیر ہے۔

متقدمین اصحابِ تزکیہ نفس کے نزدیک تمام منازل و مقاماتِ سلوک کی غرض و غایت انہی مقاصد کا حصول ہے۔ جن کے حصول کے بعد مومن مقامِ احسان پر پہنچ جاتا ہے۔ یہی وہ مقامِ احسان ہے، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں تعبیر فرمایا ہے: أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ وَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (تو اس طرح اللہ تعالیٰ کی بندگی بجا لائے گویا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تجھ میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو سکے تو اس طرح بندگی کرے کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] سورۃ البیّنہ آیت نمبر ۵

تو تجھے دیکھ رہا ہے [۱] ۔۔۔ اور بندۂ مومن کا اپنے اندر اس کیفیت کو پیدا کر لینا احسان، تزکیۂ نفس اور حقیقت عبودیت ہے۔ قلب کو اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور اس کے اسماء و صفات کی مقتضیات پر مرتکز رکھنا مومن کی معراج ہے۔

فطرتِ انسانی کے داعیے ابن قیمؒ کے مطابق بنیادی طور پر انسانی فطرت میں تین قسم کے داعیے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے جو داعیہ انسان کی فطرت پر غالب آجاتا ہے، انسان کے افعال اسی کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔

اوّل۔ شیطانی داعیہ: یہ داعیہ انسان کو شیطانی اخلاق و عادات اختیار کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ اور انسان اس داعیے کے تحت، تکبر، حسد، بغاوت و عدوان، فخر و تعلّی، شرپسندی، ایذارسانی، فساد اور دھوکہ جیسی شیطانی صفات سے متصف ہونے پر آمادہ ہوتا ہے۔

دوم۔ حیوانی داعیہ: یہ داعیہ انسان کو حیوانی اخلاق و اطوار اپنانے پر اُبھارتا ہے اور وہ اس داعیے کی تحریک پر شہوت پرستی، شکم پرستی اور حرص و لالچ جیسی مذموم عادات کو اختیار کر لیتا ہے۔ یہ داعیہ درحقیقت شہوات کا داعیہ ہے۔

سوم۔ ملکوتی داعیہ: یہ داعیہ انسان کو ملائکہ کے اخلاق اختیار کرنے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ مثلاً توحید، احساسِ عبدیت، شکرگزاری، خیرخواہی، نیکی و اطاعت اور حصولِ علم وغیرہ۔

انسانی فطرت میں موجود پہلی دو اقسام کے داعیوں کو دبا کر بتدریج محو کرنا اور تیسری قسم کے داعیے کو اُبھار کر بتدریج انسان کی فطرت میں سمو دینا درحقیقت انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد ہے۔ وہ تمام اصولِ مدنیت، تزکیۂ نفس کے وہ تمام طریقے، انسانی معاشرے کو راہِ اعتدال پر رکھنے کے وہ تمام قوانین اور افعال کے حُسن و قبح کے وہ تمام ضابطے جو تعلیماتِ وحی پر مبنی ہیں۔ ان کا مقصد ان ملکوتی داعیوں کو اُجاگر کرنا، شیطانی داعیوں کو یکسر محو کرنا اور حیوانی داعیوں کو مناسب حد تک محدود اور پابند رکھنا ہے تاکہ انسان صحیح معنوں میں خطۂ ارضی پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بن سکے۔

پہلی اُمتیں اپنے انبیا کی تعلیمات میں دانستہ یا نادانستہ طور پر تحریفات کی مرتکب ہوتی رہی ہیں۔۔۔

---

[۱] مسند امام احمد عن عمرؓ، مسلم اور ترمذی عن عمرؓ

گمراہ کن نظریات سے متاثر ہو کر دین میں نت نئی بدعات شامل کرتی رہی ہیں۔ آخر کار ان کی تعلیمات کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ امتوں کے اس مرضِ کہن کی تشخیص عطا کی گئی تھی۔ آپؐ نے ان کے ایک ایک مرض کی نشاندہی کر کے اپنی امت کو اس سے بچنے کی تلقین کی۔ آپؐ نے تجرید و تزکیہ کے ان تمام راستوں پر چلنے سے منع فرما دیا جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ آپؐ نے ان تمام ذرائع کو مسدود کر دیا جو بنی نوعِ انسان کو رہبانیت کی اجاڑ اور خوفناک راہوں پر دھکیل دیتے ہیں۔ جب ہم حدیث اور سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایسی بہت سی احادیث ملتی ہیں جن سے یہ تصور اجاگر ہوتا ہے کہ مسلسل روزے رکھنا، روزے کو روزے سے ملانا، جسم کو اذیت دینا، تجرد کی زندگی بسر کرنا، رات بھر جاگنا، گوشت اور دیگر طیباتِ رزق سے پرہیز کرنا، تکلّفاً مندے حالوں رہنا اور انسانی معاشرے میں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے پہلو تہی کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کوئی قابلِ تحسین بات نہ تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرتِ طیبہ میں ایک چیز جو بہت نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی تمام زندگی اپنے نفس پر قابو رکھنے اور کفر و عصیان کی شیطانی قوتوں کے خلاف جدوجہد سے تعبیر ہے۔ انہوں نے اپنے رب کی رضا کے حصول میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اسلامی معاشرہ اسی نہج پر چلتا رہا لیکن عباسی عہد کی ابتدا ہی سے اسلام کو دین و دنیا کے دو خانوں میں تقسیم کر لیا گیا۔ عیسائی راہبوں، ہندو جوگیوں، فلوطینی اشراقیوں، صابیوں اور مانویوں کے اثرات کے تحت مسلمانوں میں بھی اس بے بنیاد اور انسانی معاشرے کے لیے تباہ کن نظریے نے جنم لیا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیاوی محبت کے تمام رشتوں کو قطع کر دے۔ خدا تک پہنچنے کے لیے نفس کشی، ترکِ طیبات اور جسمانی اذیت کو ضروری قرار دے دیا گیا۔ یہ سراسر رہبانیت کی صدائے بازگشت تھی۔ تب تزکیۂ نفس، تجرید، اللہ تعالیٰ کی محبت و رضا جوئی کے لیے ضروری ٹھہرا کہ صوف کا لباس پہنا جائے، چلہ کشی کی جائے گھر بار چھوڑ چھاڑ کر غاروں اور کھوہوں میں ٹھکانہ بنا لیا جائے۔ آپ کو متقدمین اصحابِ تزکیہ نفس میں یہ چیز ہرگز نہیں ملے گی۔ متقدمین کا طریقِ تزکیہ قرآن سے ماخوذ تھا، اُن کی اصطلاحات ٹھیٹھ اسلامی تھیں۔ ان کی عبادات

اور اوراد و وظائف کا وہی رنگ تھا جو صحابہ کرام کا تھا۔ کرامات و مکاشفات کی بھرمار نہ تھی۔ علمِ غیب ذاتی اور کائنات پر تصرف کے دعوے نہ تھے۔ وہ سیدھے سادے پاک دل اور پاکباز مسلمان تھے۔ اُن کی محفلوں میں علم کے چشمے رواں تھے، وہ اسی معاشرے میں رہ کر لوگوں کی تربیت کر رہے تھے۔ علم کے متلاشی اُن کی صحبت میں علومِ دینی سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ اُن کی نگاہِ تیز دلِ وجود کو چیر جاتی تھی۔ اُن کی درویشی سے حجاج جیسے جابر، منصور جیسے سیاست دان اور مامون جیسے عالم و فاضل خوف کھاتے تھے۔ یہ لوگ اسلام کے مقاصد سے خوب آگاہ تھے۔ اس لیے یہ آپ کو کبھی تو قاضی کے روپ میں عدل و انصاف کرتے نظر آئیں گے، کبھی علمِ نبوت کی اشاعت کرتے دکھائی دیں گے۔ کبھی مملکتِ اسلام کی سرحدوں کا دفاع کرتے دکھائی دیں گے اور کبھی آپ اُن کو معتصم کے دربار میں اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کرتے ہوئے دیکھیں گے۔ یہ وہ دَور تھا۔ جب شریعت و طریقت یا شریعت و حقیقت میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ تصوّف درحقیقت احسان اور تزکیۂ نفس ہی کا دوسرا نام ہے۔

دوسری صدی کے وسط میں اہلِ زہد کے لیے "صوفی" کے لقب کا استعمال شروع ہو گیا تھا۔ حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) اور ابو ہاشم (متوفی ۱۵۰ھ) پہلے شخص ہیں جن کو "صوفی" کہا گیا[1]۔ تاہم دوسری صدی ہجری کے اواخر تک زہد، فقر اور تصوّف ایک ہی چیز کے مختلف نام تھے۔ اپنے وطن سے دُور ہونے کی بنا پر اُن کو "غربا" کہا جاتا تھا۔ صوف کا لباس پہننے کی وجہ سے ان کو "صوفی" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ کثرتِ سفر کی بنا پر "سیاحین" کے نام سے معروف تھے۔ اہلِ شام ایسے لوگوں کو "جوعیہ (بھوک اور فقر و فاقہ برداشت کرنے والے لوگ)" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ مال و دولت سے تہی دست ہونے کی وجہ سے "فقراء" کہلاتے تھے[2]۔

قرنِ ثالث میں بتدریج فقراء اور زہاد میں سے مخصوص لوگوں کو "صوفی"[3] کہا جانے لگا۔ کیونکہ عُبّاد اور زُہّاد نماز روزے اور دیگر عبادات میں نہایت باریک بینی سے چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کا

---

[1] التصوّف الاسلامی ص ۱۷۔

[2] التعرف لمذہب اہل تصوف ص ۲۱ تا ۲۶، تاریخ ادبیاتِ ایران ص ۲۹۸، ۱۷۲ م۔

[3] التصوف الاسلامی ص ۱۶۔

تو بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن وہ اعمالِ قلوب کی حلاوت اور تہذیبِ نفس کے ذائقے سے آشنا نہیں تھے۔ بقول اصحابِ تصوّف تزکیۂ نفس ان کا طریق نہ تھا۔ پھر بتدریج تصوّف ایک الگ ادارے کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ جنیدؒ بغدادی (متوفی ۲۹۷ھ) پہلے شخص ہیں جنہوں نے صوفیانہ معانی وضع کیے، ان کی شرح لکھی اور ان کو تعلیم دی۔[1]

تصوّف کیا ہے؟

تصوّف کے اشتقاق اور صوفی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ اصحابِ تصوّف میں سے ایک جماعت کا خیال ہے کہ صوفی "صفاء" سے مشتق ہے۔ چنانچہ بشر بن الحارثؒ کہتے ہیں۔

"صوفی وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے قلب کو صاف کر لیا ہو۔"[2]

کچھ لوگوں نے اِن الفاظ میں تصوف کی تعریف کی ہے۔

"صوفی وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ صاحبِ کرامت ہے"[3]

کتانیؒ کہتے ہیں۔ "تصوّف اخلاق کا نام ہے جو آپ سے اخلاق میں بڑھ گیا وہ صفائی میں آپ سے بڑھ گیا۔"[4]

ابو علی رودباریؒ کہتے ہیں۔ "کدورتِ طبع کے بعد صفائے قرب کا نام تصوّف ہے۔"[5]

سید علی ہجویریؒ رقمطراز ہیں۔ "تصوّف اور صوفی دراصل لفظ "صفاء" سے مشتق ہیں۔ اس کی ضد "کدر" (یعنی کدورت) ہے۔ پس جس شخص نے اپنے اخلاق اور معاملات کو مہذب بنایا اور اپنی طبیعت کو کدورتوں اور کھوٹ اور میل سے پاک صاف کر لیا اور اسلام یعنی حق تعالیٰ کی سچی عبودیت کا وصف اپنے اندر پیدا کر لیا تو وہ صوفی بن گیا اور اہلِ تصوّف میں شامل ہو گیا۔"[6]

[1] التصوف الاسلامی ص ۱۷، تاریخ ادبیاتِ ایران ص ۲۹۸

[2] التعرف لمذہب اہل التصوّف ص ۲۱ [3] ایضاً

[4] الرسالۃ القشیریۃ ص ۱۳۹ [5] ایضاً [6] کشف المحجوب ص ۹۰

سہیل بن عبداللہ تستریؒ سے پوچھا گیا کہ صوفی کسے کہتے ہیں تو انھوں نے فرمایا:

"جو کدورتوں سے پاک صاف ہو گیا ہو" [1]

ابوالقاسم قشیری کے استاد ابو علی دقاق نے بھی تقریباً یہی تعریف کی ہے[2]۔

کچھ ارباب تصوف لفظ "صوفی" اور تصوف کو "صوف" سے مشتق قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ صوف کا لباس پہننے کی وجہ سے اہل زہد اور اصحاب تزکیہ نفس کو صوفی کہا جانے لگا۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ اصحاب صفہ اور بعض دیگر صحابہ زہد اور فقر کی بنا پر صوف کا لباس پہنا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ابوبکر کلاباذیؒ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی صوف کا لباس پہنا کرتے تھے[3]۔ حسنؒ کہتے ہیں کہ میں نے ستر بدری صحابہ کو دیکھا ہے، وہ صوف کا لباس پہنا کرتے تھے[4]۔

بعض کہتے ہیں کہ "صوفی" "صُفّہ" سے مشتق ہے۔ کیونکہ صوفیہ کے اوصاف اصحاب صفہ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ صُفّہ سے "صُفَّیہ" بنا اور پھر کثرتِ تداول کی بنا پر "صوفیہ" بن گیا۔ بعض کی رائے ہے کہ صوفیہ کو صوفی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی بلند ہمتی، اپنی تمام تر جمعیتِ قلبی اور باطن کے تمام اسرار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پہلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں[5]۔

کچھ اہلِ علم کی رائے ہے کہ بیت اللہ کی خدمت میں جو شخص سب سے پہلے مستغرق ہوا اُس کا لقب "صوفہ" تھا اور نام غوث بن مرّ یا ابنِ غوث بن مرّ تھا۔ چونکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف انقطاع میں "صوفہ" سے مشابہ ہوتے لہٰذا انھوں نے اپنا نام صوفیہ رکھا[6]۔ ابن جوزیؒ نے اسی وجہِ تسمیہ کو ترجیح دی ہے[7]۔

"صفہ" سے نسبتِ صوفی کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اسی طرح "صفا" سے صوفی کا اشتقاق بھی

---

[1] التعرف لمذہب اہل التصوف ص ۲۵

[2] الرسالۃ القشیریۃ ص ۱۳۸

[3] التعرف لمذہب اہل التصوف ص ۲۲ [4] ایضاً ص ۲۳ [5] ایضاً ص ۲۴

[6] تلبیسِ ابلیس ص ۲۲۵ تا ۲۲۶ [7] ایضاً ص ۲۲۷

مقتضائے لغت کے لحاظ سے بہت بعید ہے۔ البتہ صوف سے صوفی، تصوّف سے متصوّف اور متصوفہ وغیرہ کا اشتقاق تو صحیح ہے۔ لیکن متقدمین اصحابِ سلوک نے بطورِ خاص صوف کو اپنے لیے کبھی مخصوص نہیں کیا۔ بلکہ سلف میں بہت سے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جو تواضع اور زہد کے اظہار کے لیے بطورِ خاص صوف کے لباس کو پہننا مستحسن قرار نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ سفیان ثوریؒ صوف کے لباس پہننے کو بدعت قرار دیتے تھے[۱]۔ ایک دفعہ حمّاد بن ابی سلیمان بصری آئے تو فرقد السنجی ان کی زیارت کے لیے صوف کا لباس پہن کر آئے تو حمّاد نے اُن سے فرمایا:

"اپنے جسم سے یہ اپنی نصرانیت اُتار دو۔"[۲]

محمد بن سیرینؒ سے کہا گیا کہ کچھ لوگ صوف کا لباس پہنتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام صوف کا لباس پہنا کرتے تھے۔ محمد بن سیرینؒ نے فرمایا:

"مجھے اپنے نبی کی سنت زیادہ محبوب ہے۔"[۳]

ابن الجوزی نے حسن بصری، ابو قتادہؒ، ابو العالیہؒ، فُضَیلؒ، ابو سلیمان، عبداللہ المبارک، ایوب سختیانی اور بعض دیگر بزرگوں سے بطورِ خاص صوف کا لباس اختیار کرنے کی کراہت نقل کی ہے[۴]۔ سلف میں اظہارِ زہد و تعبد کے لیے صوف کے لباس کے اختصاص کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔

ابن الجوزیؒ اور دیگر علماء کی نقل کردہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں صوف کا لباس مسیحی راہبوں اور صابیوں کے لیے مخصوص تھا۔ اور یہ اُن کا امتیازی لباس تھا۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بعض مسلمان اہلِ زہد بھی صوف کا لباس پہنا کرتے تھے۔ اور بعد میں لفظ "صوفی" بقول ابو علی دقاق غالب طور پر اہلِ زہد کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لغتِ عربی کے

---

[۱] التصوف الاسلامی ص ۱۲ تلبیس ابلیس ص ۲۶۵

[۲] ایضاً ص ایضاً ایضاً ص ۲۶۴

[۳] منہاج السنۃ النبویۃ ۲ : ۱۲۲

[۴] تلبیس ابلیس ص ۲۴۳ تا ۲۶۶

لحاظ سے اس لفظ پر کسی لغوی قیاس اور اشتقاق سے استشہاد نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ گویا لقب کی طرح ہے[1]۔ کیونکہ اکثر ارباب تصوف کا اتفاق ہے کہ صوفیہ کو یہ لقب صوف پہننے کی وجہ سے ملا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ "تصوف" عجمی کلمہ ہے اور اس کی اصل ہندی ہے اور اس کا معنی ہے حقیقتِ اولیٰ یعنی حقیقتِ الٰہیہ کی طرف سعی و جہد کرنا، یہ وہ اساس ہے جس پر وحدۃ الوجود کے نظریے کی تمام عمارت قائم ہے[2] حامد الفقیؒ کی مذکورہ بالا رائے اور ان کا نقطۂ نظر فلسفہ زدہ اور متاخرین متصوفہ میں سے اکثر کے متعلق تو بہت حد تک صحیح ہے۔ لیکن متقدمین صوفیہ کے مقاصد پر اس مفہوم کا اطلاق کرنا صحیح نہیں۔ بلکہ پہلی دو صدیوں تک فلسفہ اور تصوف (یا زہد) جڑواں بھائی نہ تھے۔ جیسا کہ حامد الفقیؒ کا خیال ہے۔ متقدمین صوفیہ کا مقصد تو صرف مقام "احسان" تک پہنچنا تھا۔ (باقی)

---

۱ الرسالۃ القشیریۃ ص ۱۳۸

۲ مدارج السالکین ۱ : ۲۶۴ (ملاحظہ ہوں حواشی استاذ حامد الفقی۔)

رسائل و مسائل

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عُمر بوقتِ ازدواج

سوال: حال ہی میں ایک کتابچے بعنوان "حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر" پر ماہنامہ بلاغ القرآن لاہور کے شمارہ مئی ۱۹۸۰ء میں ص ۱۸، ۱۹ پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو پمفلٹ کے ملنے کا پتہ "احمدی بلڈنگس لاہور" درج ہے۔ دوسری طرف قابلِ توجہ یہ امر بھی ہے کہ ماہنامہ بلاغ القرآن کے تبصرے ہی سے واضح ہے کہ یہ جریدہ منکرینِ سنّت کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر قیامت کمال یہ ہے کہ رسول پاکؐ اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ کے متعلق ایک مسلّمہ حقیقت کے خلاف کوئی نامور صاحبِ تحقیق ایک اختلافی آواز نہیں اٹھا رہا بلکہ اتنی بڑی انخراقی مہم کے لیے کوئی غیر معروف صاحب ابوطاہر عرفانی کے نام سے ایک کتابچہ لکھ کر لاتے ہیں۔

کتابچہ تو میرے پاس فی الحال نہیں ہے، اس پر شائع شدہ تبصرہ روانۂ خدمت ہے۔ اس کے متعلق آپ کچھ ارشاد کریں تو ہمارے لیے باعثِ تقویت ہوگا۔

جواب: (از مولانا عبدالملک منصورہ)

تہذیبِ مغرب سے متاثر ہو کر اسلام سے ناواقف ایک طبقہ نے اسلام کی انتشار انگیز ترجمانی کا کام اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ یہ طبقہ اسلام کے نام سے مغربی تہذیب کو اسلام کا جامہ پہنا رہا ہے۔ ان مغرب گزیدہ مفتیوں نے جہاں اور بہت سے فتاویٰ جاری کیے ہیں ان میں سے ایک فتویٰ یہ بھی ہے کہ نوعمری کی شادی کی اسلام میں اجازت نہیں ہے اور یہ بھی کہ شادی کے لیے ہم عمر ہونا شرط ہے۔ اس سلسلے میں جب قرآن و حدیث اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے عملی نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ تاریخی حقائق

سامنے لائے جاتے ہیں تو یہ لوگ بے دھڑک اُن کا انکار کر دیتے ہیں - اسی سلسلے میں ابوطاہر عرفانی نام کے ایک گم نام شخص نے ایک کتابچہ "حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر" لکھ کر یہ ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش کی ہے کہ اُن کی عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے وقت ۱۸ – ۱۹ سال تھی۔ اس کتابچہ پر منکرین سنت کے چکڑالوی گروپ کے ماہنامہ بلاغ القرآن میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔ تبصرہ نگار نے ابوطاہر عرفانی کی کوشش کی تعریف کی ہے اور اسے اس لحاظ سے قابلِ قدر قرار دیا ہے کہ اس سے کتب احادیث بخاری و مسلم کی قدر و منزلت میں کمی آجائے گی - لیکن اس کے ساتھ ہی بلاغ القرآن کا مفتی ابوطاہر عرفانی صاحب پر بھی اعتراض کرتا ہے "کہ روایات سے جس طرح یہ ثابت ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ رض صدیقہ کی عمر ۶ یا ۷ برس تھی اور رخصتی کے وقت ۹ برس - ابوطاہر عرفانی صاحب اس کے مقابلے میں ۱۸ – ۱۹ برس کے دعویٰ پر صریح روایت نہیں پیش کر سکے"۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود بلاغ القرآن کے تبصرہ نگار کو ابوطاہر عرفانی کی کوشش سے خوشی ہوئی ہے کہ اس سے بہر حال کتبِ حدیث کی حیثیت تو مجروح ہوگی۔

تبصرہ نگار کے نزدیک شادی کے لیے ہم عمر ہونا شرط ہے اس لیے اس کا مقصد اور اس کی خواہش یہ ہے کہ احادیث و روایات کی بنیاد پر سرے سے گفتگو ہی نہ کی جائے بلکہ کتب احادیث و تواریخ کو دریابرد کر کے اپنی آزاد رائے کی بنیاد پر سارے فتاویٰ جاری کیے جائیں۔

تبصرہ نگار کی یہ جاہلانہ جسارت دیوانے کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ حد سے تجاوز کرتے ہوئے اس بات کو بنیاد بنا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریضاً توہین کرتا ہے کہ آپ کی شادی حضرت عائشہ رض سے بڑھاپے میں ہوئی۔

لکھتا ہے:

"مگر افسوس ہے بخاری شریف کی صحت کو پایۂ اعتبار سے گرانے کے باوجود عرفانی صاحب نے جو خدمت انجام دی ہے، ہے تو قابلِ قدر، مگر اس کے سوا نہیں ہے کہ قیامت تک کے لیے ساٹھ ستر سالہ بوڑھے نوابوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے لیے سولہ سترہ سالہ دوشیزاؤں کا ہم عمر جوانوں کے ساتھ شادی کی تمناؤں کے پیدائشی حق کا خون کر کے رکھ دیا ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عائشہ رض کے ساتھ شادی ۵۴ برس کی عمر میں ہوئی ہے۔ آپ کا وصال

(باقی بر صفحہ ۴۰)

مطبوعات

یہودیت و مسیحیت از جناب ڈاکٹر احسان الحق رانا۔ ناشر: مسلم اکادمی، محمد نگر، لاہور۔ صفحات ۲۹۶
رنگین کور۔ قیمت: -/۴۰ روپے خصوصی مجلد -/۴۵ روپے

یہ کتاب کیا ہے اور کیا نہیں کی بات تو رہی الگ، دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اسے بڑی تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ کتاب اور کتاب سے زیادہ اس کے مؤلف کو جن "مراحلِ شوق" سے گزرنا پڑا ہے اُن کو جان کر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ مؤلف کو اس شاندار کام پر بڑا بھاری انعام ملا۔

ڈاکٹر احسان الحق رانا تعلیمی لحاظ سے ایم۔ ایس سی (آنرز) پی۔ ایچ۔ ڈی (پنجاب) ایم۔ ایس (کولمبیا) کے مراتب رکھتے ہیں۔ پاکستان کے واحد ادارہ حفظانِ صحت (کالج آف کمیونٹی میڈیسن) لاہور میں علم الاغذیہ والصحت کے پروفیسر کی حیثیت سے بیسویں گریڈ پر مامور تھے۔ اس خاص شعبے میں چونکہ کوئی دوسرا صاحبِ استعداد آدمی موجود نہ تھا، اس لیے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کو مامور رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب سائنس کے آدمی تھے اور صحت و غذا کے مسائل پر مطالعہ کرتے، لکھتے اور دوسروں کو تعلیم دیتے تھے۔ ٹیلیفون ڈائرکٹری سے اُن کا پتہ حاصل کر کے کسی مشنری ادارے نے اُن کو امریکہ سے "زندہ کلام" کے نام سے ایک بائیبل بھجوائی۔ اسے پڑھا تو انبیاء کے بارے میں تکلیف دہ مندرجات پڑھ کر تجسس پیدا ہوا۔ عیسائی اداروں سے مراسلت کی اور مسیحی لٹریچر کا مطالعہ شروع کیا۔ پھر آہستہ آہستہ بہت سی کتابیں خریدیں اور ۶ سال کے مطالعہ و تحقیق کے بعد یہ کتاب لکھی۔

ابھی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی کہ ایک مسیحی ڈاکٹر ایل پیٹرک اسلام آباد سے چلے اور تھانہ سول لائنز لاہور آکر ۳ دسمبر ۱۹۸۰ء کو ڈاکٹر رانا کے خلاف ایک بے سروپا رپورٹ درج کرائی کہ ڈاکٹر رانا کی کتاب سے اُن کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ دلچسپ یہ کہ اس وقت تک کتاب چھپی ہی نہ تھی۔ بصورتِ

مسودہ تھی۔ شہر بسا نہیں، اچکے پہلے موجود۔ مولف کو پکا مجرم بنانے کے لیے دعویٰ یہ کیا گیا کہ یہ کتاب سرکاری کاغذ پر سرکاری ادارے میں چھپی ہے اور سرکاری خرچ پر ہی لوگوں کو دی گئی ہے۔

مسیحی حضرات کا رتبہ و اثر دیکھیے کہ اُسی دن سرکاری مشینری حرکت میں آگئی۔ بغیر اس کے کہ کتاب کے مندرجات کی جانچ پڑتال ہوتی اور بغیر اس کے کہ ڈاکٹر رانا کے کالج کے پرنسل کے علم میں یہ معاملہ لایا جاتا، ۳ دسمبر ہی کی رات کو ہوم سیکرٹری حکومت پنجاب کا یہ حکم ملا کہ ۶ دسمبر کو پیش ہو کر وجہ بتائیں کہ کیوں نہ اُن کی کتاب کو ضبط کیا جائے۔ مگر پیش ہونے اور وجہ بتلانے کی تاریخ آنے سے پہلے ہی ۴ اور ۵ دسمبر کی درمیانی رات کو پولیس ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچی، بلا وارنٹ گھر اور دفتر کی تلاشی لی، تمام متعلقہ کاغذات قبضہ میں کیے اور پروفیسر رانا کو تھانہ سول لائینز میں لے کر بند کر دیا۔ نہ گھر والوں کو پتہ دیا اور نہ اُن کی ضمانت لی، کیونکہ اُن کو ناقابلِ ضمانت جرم کے تحت پکڑا گیا تھا۔ آخر اس ۶۵ سالہ محقق ڈاکٹر کو ہتھکڑی لگا کر مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا، اور ۱۵ دسمبر کو عبوری ضمانت منظور ہوئی۔ اشاعت سے پہلے ہی کتاب کی ضبطی کے احکام بھی جاری ہو گئے۔ اُدھر حکومت نے محکمانہ تحقیقاتی کارروائی کرائی اور افسر بکارِ خاص نے چھان بین کر کے ڈاکٹر رانا کو الزامات سے بری قرار دیا۔ لیکن ملازمت سے برطرفی کا جو حکم پہلے سے نافذ ہو چکا تھا، اسے واپس نہیں لیا گیا اور ڈاکٹر صاحب کی ملازمت ختم ہو گئی۔

اس صورتِ واقعہ سے جب اربابِ علم و نظر واقف ہوئے تو بہت سے ممتاز علما اور سماجی اکابر یکم جنوری ۱۹۸۱ء کو "مجلسِ تحفظِ اقدارِ اسلامی" کے تحت جمع ہوئے۔ مجلس کا مامور کردہ وفد گورنر پنجاب سے ملا۔ تب ڈاکٹر صاحب کو بری قرار دیا گیا۔ اور ۱۸ جنوری ۱۹۸۱ء کو کتاب کی ضبطی کا حکم منسوخ ہوا۔

میرا خیال ہے کہ اس کہانی کو بیان کرنے کے بعد کتاب کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، تاہم میں حافظ نذر احمد صاحب کے چند الفاظ یہاں نقل کرتا ہوں جو انھوں نے کتاب کے پیش لفظ کے طور پر مکہ مکرمہ میں لکھے:۔

"کتاب اوّل سے آخر تک بائیبل مقدس اور دیگر ثقہ مسیحی کتب کے اقتباسات سے پُر ہے ...... جن کی تعداد کم و بیش پانچ سو ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بالعموم (ان اقتباسات کے ساتھ۔ مدیر) اپنی طرف سے ...... چند تمہیدی کلمات لکھنے پر اکتفا کیا ہے یا چند سطر تجزیہ کیا ہے"۔

یوں سمجھیے کہ یہودیت اور مسیحیت کے متعلق مستند حوالوں سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ اہل کتاب خدا کی کتابوں اور اُس کے دین کی حفاظت نہیں کر سکے، تعلیمات ضائع بھی ہوئیں اور جو بچیں ان میں تحریف کی جاتی رہی۔ خدا کے انبیاء پر بہتان باندھے گئے۔ اور ایسے ایسے عقیدے اور تصورات گھڑ لیے گئے جن کے لیے خدا کے دین میں کوئی جگہ نہیں۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کتاب کی نشرواشاعت میں صدیقی ٹرسٹ (نسیم پلازا، نشتر روڈ، کراچی) کا تعاون بھی شامل ہے۔

بائبل کی تالیف اور تحریف مؤلف مولانا حکیم انیس احمد صدیقی۔ ناشر: صدیقی ٹرسٹ، نسیم پلازا، نشتر روڈ کراچی ۵۔ صفحات: ۵۹ قیمت: ۳/- روپے

اس کتابچے پر تفصیل سے کچھ لکھنے کا موقع نہیں۔ ساری بات عنوان سے ظاہر ہے۔ لفظی اور معنوی دونوں طرح کی تحریف پر گفتگو کی گئی ہے۔ مقالہ تحقیقی ہے اور معلومات افزا۔

خاتونِ خانہ تالیف: الاستاذ مظہر علی ادیب۔ ناشر: مکتبہ ذکریٰ، رام پور (انڈیا)

سوا سو صفحات کی یہ کتاب آفسٹ کی خوبصورت طباعت اور رنگین ٹائیٹل ہی سے آراستہ نہیں، بلکہ مظہر علی ادیب صاحب نے بات کو بڑی ادبیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک طرف پردے کے شرعی احکام کی وضاحت اور دوسری طرف موجودہ حالات میں خواتین کو جن مسائل کا سامنا ہے، اُن کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ مؤلف نے یہ بھی دکھایا ہے کہ مغرب میں مخلوط بے پردہ معاشرت نے کیا نتائج و اثرات پیدا کیے ہیں اور یہاں کی خواتین کو کس طرح اپنا تحفظ کرنا چاہیے۔

موضوع کے مطابق تو جو کچھ مظہر علی ادیب صاحب نے لکھا ہے، مناسب لکھا ہے اور پردہ (مؤلفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ) کے مقابلے میں سادہ اور آسان اور مختصر گفتگو کی ہے۔ مگر مقدمے میں یا کسی اور طرح اصل توجہ خواتین کو بھی اس پر دلانی چاہیے کہ ایمان کیا ہے اور حضورؐ کو خدا کا رسول ماننے کے

بعد تسلیم و رضا کی کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں - ایمان لانے والوں کو تو صرف یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے کسی معاملے میں کیا فرمایا ہے اور جو کچھ فرمایا اُس کا مفہوم کیا ہے اور اس سلسلے میں حضورؐ اور حضورؐ کا تیار کردہ سوسائٹی کا نمونہ عمل کیا تھا - اس کے بعد چند ذ چکّوں میں پڑنا اور احکام سے گریز کی راہیں نکالنا یا کھلی بغاوت کرنا اور من پسند مفاد اور دلچسپیوں کو اہمیت دینا مسلکِ اہلِ ایمان کے خلاف ہے -

---

ماہنامہ تعلیمات کا سیّد مودودیؒ نمبر

ترجمان مجلہ من جانب انجمن فاضلین ادارہ تعلیم وتحقیق پنجاب ، نیو کیمپس ، لاہور
صفحات : ۲۱۲ - قیمت : سیّد مودودیؒ نمبر -/۱۵ روپے - عام شمارہ ۲/۵۰ روپے
چندہ سالانہ -/۲۵ روپے

اس خاص نمبر کا اتنا ہی تعارف کافی ہے کہ اس میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تعلیمی افکار و نظریات پیش کیے گئے ہیں - تین ایڈیٹروں کے علاوہ متعدد نامور ملکی اور غیر ملکی لکھنے والوں کی کاوشیں اس میں شریک ہیں - یہ نمبر خاصا مقبول ہوا ہے - رنگین سرورق دبیز آرٹ پیپر پہ ہے -

---

اعتذار

ماہ جنوری کے پہلے نصف میں مجھے دو سفر اسلام آباد کے پیش آئے اور اب کراچی کے سفر کی تیاری ہے - شدید مصروفیت کی وجہ سے بہت سی ضروری کتابوں کا تعارف مرتب نہیں کر سکا - مصنفین اور ناشرین سے معذرت -

(نعیم صدیقی)

(بقیہ اشارات) ڈرامہ معلوم ہوتی ہیں۔

اتحاد بڑی اچھی چیز ہے۔ اتحاد ضرور کیجیے، مگر پہلے اس کے لیے دل و دماغ اور اپنے کردار کو تیار کر لیجیے۔ ذہن میں اختلاف پسندی اور انتشار انگیزی کے جن جراثیم نے برسوں سے اڈے بنا کر انڈے بچے دے رکھے ہیں، کبھی ان سے نجات پانے کی فکر کیجیے۔ آپ حضرات اتحاد کے سکے کو بازارِ سیاست میں اس بُری طرح کھوٹا کرا چکے ہیں کہ اب اگر دوبارہ اسے سامنے لانا ہے تو اپنی دھات کو ہر قسم کے کھوٹ میل سے پاک کیجیے اور عوام کو بھی صاف صاف بتائیے کہ ہم سے کیا غلطیاں ہوئیں اور اب ہم ان کی تلافی کس طرح کر رہے ہیں۔

اتحاد کا پروگرام نہ تو محض وفاقی کونسل کے ردِّ عمل کے طور پر اختیار کیجیے، اور نہ دیر سویر آنے والے انتخابات کو پیش نظر رکھ کر۔ بلکہ اتحاد اُصولوں پر کیجیے، یعنی اسلام کے غلبہ و برتری کے لیے اور پاکستان کی وحدت و سلامتی کے لیے۔ ایسا اتحاد انتخابی اور غیر انتخابی ہر قسم کے حالات میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

خدا آپ سب کو سچے اسلامی اتحاد کی توفیق دے۔

(بقیہ رسائل و مسائل)

۶۳ برس کی عمر میں ہوا ہے۔ اور اس حال میں کہ آپ پر بڑھاپا نہیں آیا تھا۔ آپ نے جو عظیم انقلاب برپا کیا، سرزمینِ عرب کو اسلام کے زیرِ نگیں کیا اور اس کے بعد قیصر و کسریٰ کو چیلنج کیا، یہ سارے کام ۵۴ برس کی عمر کے بعد کی کوششوں اور مجاہدانہ کارروائیوں، بدر، احد، احزاب، فتح مکہ، حنین اور تبوک کے نتیجے میں سرانجام پائے۔

لیکن بلاغ القرآن کا بے لگام اور گستاخ تبصرہ نگار آپ کو ۵۴ برس میں بوڑھا قرار دے کر اس بنیاد پر مذکورہ دل آزار جملے لکھ جاتا ہے۔ فقہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس انداز سے تعریضاً غیر شعوری طور پر بوڑھا کہنے کو بھی کفر کی بات قرار دیا ہے (عالمگیری) اس بات کی ضرورت ہے کہ اس طرح کے دریدہ دہن اور آزادہ منش لوگوں کو لگام دی جائے۔

تصحیح نامہ متعلق بہ شمارہ جنوری

اوائل نومبر سے اب تک ایسی مصروفیات رہیں کہ پروف جلدی میں دیکھے گئے۔ اس کام کے لیے کوئی معاون بھی موجود نہیں ہے۔ اس وجہ سے خاصی غلطیاں سامنے آئیں۔ قارئین مندرجہ ذیل تصحیحات کرلیں۔

ص	۱۳	(۲۰۵)	سطر ۳۰	صحیح الفاظ، عَمَّ أمرَنَ۔
ص	۱۸	(۲۱۰)	سطر ۴	"لا یقی دون" کے بجائے "لا یَنیف دون"
ص	"	(")	" ۵	پوری عبارت یوں ہے: "وہ انفرادی رائے کو اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ جب تک باہم مل کر کسی رائے پر متفق نہیں ہو جاتے تھے عمل درآمد نہیں کرتے تھے۔"
ص	۱۸	(۲۱۰)	سطر ۱۲	لفظ "مفسرین" سے پہلے کا لفظ "تمام" کاٹ دیں۔
ص	۲۰	(۲۱۲)	سطر ۵	"ختم کرکے" کے بجائے "ختم کرنے"
ص	۳۵	(۲۲۷)	سطر ۱۱	لفظ "عَمَامَةٌ" کے بجائے "عِمَامَةٌ"
ص	"	(")	سطر ۱۶	"اُعْتُمَّ" کے بجائے "اِعْتَمَّ"
ص	۳۸	(۲۳۰)	سطر ۱۲	"رحمۃ اللہ" کے بجائے "رحمہ اللہ"
ص	۳۹	(۲۳۱)	سطر ۴	"اس طرح" کے بجائے "یا اس طرح"
ص	"	(")	" ۹	"جمرزی" کے بجائے "جزری"
ص	"	(")	" ۱۱	"مصالح" کے بجائے "معارف"
ص	۴۰	(۲۳۲)	سطر ۶	لفظ "استطاعت" سے پہلے "یا عدم" کا اضافہ۔
ص	"	(")	سطر ۵	لفظ "مجبوری کے بعد" کے بغیر "کا اضافہ
ص	"	(")	سطر ۱۲	"المُحَقِّقِیْنِ" کے بجائے "المحققین"
ص	"	(")	سطر ۱۲	"یَجِبُ" سے پہلے "لَا" کا اضافہ۔

قلمی معاونین سے التماس ہے کہ وہ مسودے بہت صاف لکھیں۔ آیات و احادیث اور عربی عبارت کو خاص احتیاط سے لکھیں، ناموں کو لکھتے ہوئے تلفظ کو واضح کریں۔ ورنہ یہاں کوئی ایسا انتظام نہیں کہ کتابیں دیکھی جائیں۔

(مرتب)

عُلماءِ دین! — عُلماءِ طِبّ — بنئیے!!

اور

ایک باعزت، موثر اور مفید ——— "ذریعہ معاش" جو

دینی خدمات کو موثر اور ان کے دائرہ کو وسیع کرنے کا ذریعہ

بھی ہے ——— اِس سے بہرہ ور ہو جائیے!

الحمدُ لِلّٰہ

کہ پاکستان میں دینی مدارس کی اسناد کو طبی تعلیم کے لیے بنیادی صلاحیت تسلیم کر لیا گیا ہے ——— اور

جَامعہ طبیّہ اِسلامیہ فیصل آباد

نے یہ فیصلہ کیا کہ دینی مدارس کے فاضل اور ثانویہ یا موقوف علیہ سے فارغ ذہین طلبہ — کو ترجیحی بنیاد پر قبول کیا جائے اور ان میں سے مستحق حضرات کو فیس وغیرہ میں خصوصی رعایت کا مستحق بھی قرار دیا جائے۔ درخواستیں بلا تاخیر مع نقول اسناد اور مدرسہ کے مہتمم صاحب کی جانب سے سیرت و اخلاق کی توثیق کے ساتھ درج ذیل پتہ پر پہنچ جانا چاہئیں۔

(پہلے درخواست پہلے داخلہ کا اُصول بھی ملحوظ رہے گا)

عبد الرحیم اشرف — ۲۷۵-جناح کالونی فیصل آباد

تفہیم القرآن

کی

مندرجہ ذیل سورتیں الگ چھپ کر آگئی ہیں

نمبر شمار	نام سورہ	قیمت	نمبر شمار	نام سورہ	قیمت
۱	تفسیر سورہ المائدہ	روپے ۱۰/-	۱۲	تفسیر سورہ الرحمٰن	روپے ۳/۷۵
۲	〃 〃 الفرقان	۵/- 〃	۱۳	〃 〃 الاحزاب	۷/۵۰ 〃
۳	〃 〃 النساء	۱۴/- 〃	۱۴	〃 〃 الصّف	۴/- 〃
۴	〃 〃 التوبہ	۱۰/- 〃	۱۵	〃 〃 آلِ عمران	۱۰/- 〃
۵	〃 〃 یوسف	۶/۷۵ 〃	۱۶	〃 〃 الزمر	۴/۲۵ 〃
۶	〃 〃 العنکبوت	۴/- 〃	۱۷	〃 〃 المؤمنون	۶/۲۵ 〃
۷	〃 〃 لقمان	۳/۷۵ 〃	۱۸	〃 〃 الفاتحہ والبقرۃ	۱۶/۷۵ 〃
۸	〃 〃 یٰسٓ	۳/۵۰ 〃	۱۹	〃 〃 المنافقون	۲/۷۵ 〃
۹	〃 〃 الحجرات	۴/۲۵ 〃	۲۰	〃 پارہ اوّل	۶/۵۰ 〃
۱۰	〃 〃 الفتح	۴/- 〃	۲۱	〃 تیسواں پارہ	۲۰/- 〃
۱۱	〃 〃 الحدید	۴/۷۵ 〃			

اِدارہ ترجمان القرآن، اِچھرہ - لاہور